قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ———

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مدیرِ مسئول: مرزا محمد خلیل

معاونین: ثریا عندلیب

محمد عمر دراز

ناشر: شیخ عبدالحمید

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۲۷۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۱۴ ——— نومبر ۱۹۸۸ء ——— شمارہ ۱۱

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۶۰ روپے

بیرونی ممالک ——— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے

فہرست

۱۔ لمعات۔ استقبالیہ طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۸۸ء ۲

۲۔ تحریکِ پاکستان اور پرویز (محترم محمد اسلام) ۱۱

۳۔ مرحوم صدر ضیاء الحق کا نفاذِ نظامِ اسلام ۳۸
(ڈاکٹر سید عبدالودود)

۴۔ لفظوں کا کھیل (محترمہ ثریا عندلیب) ۶۴

۵۔ ابوالاعلیٰ مودودی (ارمغان ثاقب) ۶۸

۶۔ حقائق و عبر:- ۷۵

i۔ یورپ میں اسلام کی تبلیغ

ii۔ علامہ طاہر القادری صاحب کی قرآن فہمی

iii۔ صدر جنرل ضیاء الحق پر امیر جماعتِ اسلامی کا تبصرہ

iv۔ روس میں مذہبی آزادی

v۔ اولیائے کرام کی صحبت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اِستقبالیہ کنونشن طلوعِ اسلام ۱۹۸۸ء

سحر در شاخسارِ بوستانے — چہ خوش می گفت مرغے نغمہ خوانے
برآور، ہرچہ اندر سینہ داری — سرودے، نالۂ آہے، فغانے

ہم صغیرانِ چمنِ قرآنِ عظیم! اسلام و رحمت۔

سابقہ کنونشن منعقدہ اپریل (۱۶، ۱۷) ۱۹۸۷ء میں، آپکا استقبال میں نے ان الفاظ میں کیا تھا:۔

"غم گسارانِ قافلۂ متاعِ بُردگان! اسلام و رحمت۔

آج ہم گیارہ سال کے طویل عرصہ کے بعد یہاں اکٹھے ہوئے ہیں تو ہمارے جذبات غم و مسرت کا ایک عجیب سا کیف لئے ہوئے ہیں کیونکہ آج کا یہ اجتماع پہلی بار اپنے مشفق استاد اور منفرد مفکرِ قرآن کے بغیر منعقد ہو رہا ہے"۔

ایک سال گزرنے کے بعد

آج کی اس تقریبِ سعید میں بھی آپ احباب کو خوش آمدید کہنے کی سعادت پھر میرے حصہ میں آئی ہے اور جب میں آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں تو میرے جذبات و خیالات میں غم کا کوئی شائبہ نہیں۔ کیونکہ اس عظیم اور منفرد مفکرِ قرآن کی روشن کردہ شمعِ قرآنی کو آپ نے جس حسنِ تدبر، شوق و ولولہ اور جذبۂ ایثار سے تھاما ہے اور اس مختصر سے عرصہ میں اس کی ضیاباریوں کو جس طرح مملکتِ پاکستان کے ہر گوشہ میں پھیلایا ہے، اسے دیکھ کر تو وہ مفکرِ قرآن بھی یقیناً خوش ہو جاتا جو ہم سے یہ کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوا تھا کہ:۔

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من — کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ ترماند

آپ نے اس دوران ثابت کر دیا ہے کہ۔

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشہ می دارد

اور تیشۂ ابراہیمیؑ سے ہر نوع کے بتانِ آذری کو مسمار کرتے اور نورِ شمعِ مصطفےٰؐ سے اس جہان کی تاریکیوں کو اُجالوں میں بدلتے آپ مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں اور آپ کی اس کارگردگی کو دیکھ کر کوئی آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ:۔

تھی اگر مے سے صراحی تیری خالی ساقی — تو چراغِ درِ میخانہ جلایا کیوں تھا؟
یوں اگر شورشِ ایام سے دب جانا تھا — کوچۂ عشق میں کیا کام تھا، آیا کیوں تھا؟

آپ نے جس کوچۂ عشق میں، مفکرِ قرآن کی قیادت میں قدم رکھا تھا، اسکی وفات کے بعد آپ اس کے ہر

تسلسلِ جاں فروشی، ہر مرحلۂ ہمت طلبی اور ہر منزلِ ایثار پر پوری تابانیوں کے ساتھ پورے اُترے ہیں یہ آپ ہی کے عجزِ صادق، ولولہ و ایثار اور عزم و استقلال کا صدقہ ہے کہ مفکرِ قرآن کی وفات پر جس شمعِ فکرِ قرآن کے متعلق عام تاثر تھا کہ اب بجھی کہ بجھی، وہ پہلے سے زیادہ روشن اور ضیا بار ہے۔

رفیقانِ گرامی! کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی آپکی ان سرفروشانہ مساعی کا اجر نہیں دے سکتا۔ اس کا بدلہ اُسی بارگاہِ عالی سے ملتا ہے جس کا ارشاد ہے کہ:-

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝ حٰمٓ سجدہ ۶۱/۳۰-۳۲

آپ کو یاد ہوگا کہ مفکرِ قرآن علیہ الرحمہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جس مکتبِ عشق کی طالبعلمی آپ قبول کر رہے ہیں اس کا دستور یہ ہے کہ:- ع اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

چنانچہ آپ نے خود عائد کردہ فریضہ کے مطابق قرآن کریم کو سمجھنا شروع کر دیا تو قرآن نے آپ پر یہ فریضہ لگا دیا کہ

ع دیکھا ہے جو کچھ تو نے اوروں کو بھی دکھلا دے

لہٰذا آپ کی ذمہ داریاں پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں اور اب آپ کو مزید تندہی اور مستعدی سے قرآن کی آواز کو فضائے عالم میں پھیلانا ہے کیونکہ زمیلانِ قرآنی! دنیائے انسانیت سے جہالت کی تاریکیوں کو صرف نورِ قرآن ہی سے دُور کیا جا سکتا ہے میں آپ سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں اور مجھے بعض حضرات کی خندۂ زیر لبی میں پوشیدہ اس شکایت کا بھی احساس ہے کہ مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری اور ملوکیت کے اژدہا ہمارے راستے کی کتنی بڑی رکاوٹ ہیں۔

میرے قرآنی ہمسفرو! میں نے تو یہی سبق حاصل کیا ہے کہ ہجومِ مشکلات آئیں، سیلِ مخالفت آئیں، موانعات کے پہاڑ راستہ روکیں لیکن اگر خدا کی کتابِ عظیم کے عشق سے سینہ معمور ہے اور اس کے عطا کردہ نظام کو دنیا میں نافذ و رائج کرنے کی آرزوؤں کا جنونِ صد ہوش آفریں آپ کے دامن میں ہے تو

ع دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

آپکو خدائے عظیم و برتر کی آخری کتاب کے ساتھ عشق ہے

تو آپ کا یہ محبوبِ دلنواز اپنی تمام تر برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ آپکی راہوں کو منور کرتا اور آپ کے راستوں کی تاریکیوں کو نگلتا چلا جائے گا کیونکہ اس کے نازل کرنے والے قادرِ مطلق، اللہ رب العالمین کا یہ ارشاد ہے کہ:-

.... نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ ..... ۝

اور جس راستے پر چلنے والوں کی یہ آرزوئیں ہمیشہ اُن کے لبوں پر رہتی ہیں کہ:-

.... رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۶۶/۸ التحریم)

آپ احباب کی اکثریت غیر معمولی حالات سے گزر کر یہاں پہنچی ہے۔ ہمارے ملک عزیز کے اہم بازو صوبہ سندھ سے آنے والے احباب آگ اور خون کی خندقیں پار کر کے آئے ہیں جبکہ ہمارے دوسرے اہم صوبہ پنجاب کے مختلف مقامات سے آنیوالے احباب حالیہ سیلاب کی طغیانیوں اور تباہ کاریوں کے سمندر پیرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ دوسرے اہم بازوؤں غیور پٹھانوں کے مسکن صوبہ سرحد اور کوہستانی جوانمردوں کی فضائے حیات آور کے مسکن صوبہ بلوچستان سے آنے والے احباب نسبتاً کم تکلیف دہ ماحول سے آئے ہیں۔

صوبہ سندھ اور صوبہ پنجاب میں وقوع پذیر ہونیوالی ہلاکتِ حرث و نسل میں سے صوبہ سندھ میں خونِ آدم کی ارزانی اور بربادی املاک اللہ کے ارشاد کیمطابق ہم انسانوں کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی شرانگیزی ہے جس کے بارے میں اس نے فرمایا ہے کہ

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ .... ۝ (۴۲/۳۰ الشوریٰ)

اور انسانوں کے اس کسبِ ید پر اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی کارفرمائی ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ.... (۵۷/۲۲ الحدید)

جبکہ صوبہ پنجاب میں برپا ہونیوالی قیامتِ صغریٰ، فطرت کی قوتوں کی بلاخیزی کا نتیجہ ہے اس سے ہونیوالے نقصانات بھی ہماری، اپنے حفاظتی انتظامات و اقدامات سے غفلت کا فطری نتیجہ ہے .... تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ قومِ سبا کے لوگ بڑے بڑے قلعے اور عمارتیں تعمیر کرتے تھے اور آبپاشی کے لیے انہوں نے بڑے بڑے بند بنا رکھے تھے۔ چنانچہ ایک بہت بڑا بند خود دارالسلطنت مآرب کے قریب تھا جسے سدِ مآرب یا عرم مآرب کہا جاتا تھا۔ یہ بند پہاڑوں کے اندر بڑی بڑی دیواریں کھینچ کر بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے اردگرد کا علاقہ سیراب ہوتا تھا اس سے یہ سرزمین ایک وسیع و عریض باغ بن گئی تھی۔ قرآن نے انکی اس خوشحالی کا تذکرہ سورۃ سبا کی آیۃ ۱۵ میں خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ لیکن دولت و حکومت اور خوشحالی کے نشہ نے ان میں بدترین قسم کی بدمستیاں پیدا کر دیں۔ انکے دارالسلطنت کا بند شکستہ حالت ہوتا رہا اور یہ قوم اپنی بدمستیوں میں مصروف اس کی ضروری مرمت سے یکسر غافل رہی۔ حتیٰ کہ اولاً اس بند کی دیواروں میں درزیں اور دراڑ پڑے اور بعد میں شگاف۔ یہ بند ٹوٹا اور اس سے سارا شہر تباہ و برباد ہوگیا اور گرد و پیش کا علاقہ ایسا ویران ہوا کہ اس میں جھاؤ اور خاردار بیریوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ قرآن کریم نے اُن کی اس عبرتناک تباہی کا ذکر سورۃ سبا کی آیات ۱۶ اور ۱۷ میں کیا ہے۔

یہی حال کچھ ہمارا بھی ہوا ہے۔ ہمارا حکمران طبقہ ہمیشہ اپنی کرسیاں بچانے اور حریفوں کو زیر دست رکھنے کی محلاتی سازشیں کرنے میں اتنا مصروف رہا کہ انہیں اپنے دریاؤں اور نہروں کا کچھ خیال نہ رہا۔ برسہا برس کی روانیٔ آب سے ان کی تہیں کیچڑ اور دُور دراز کے پانی کی میل کچیل سے اٹتی رہیں۔ لیکن کسی کو نہ یہ سوچنے کی فرصت ملی کہ ان کی تہوں کو اتنا گہرا رکھنا ضروری ہے

کہ یہ بارشوں کے موسم میں کثرت سے آنے والے پانی کو اپنے ساحلوں کے اندر پابند رکھ سکیں، CONTAIN کر سکیں۔ اور نہ ہی کسی نے ان کے کناروں کو بلند اور مضبوط رکھنے پر توجہ دی زیادہ دُور کیوں جائیے یہیں پڑوس ہی میں گلبرگ اور شاہ جمال کے درمیان بہنے والی نہر کو دیکھئے جو آجکل سوکھی پڑی ہے اور خود معلوم کر لیجئے کہ اسکی تہہ میں جمع شدہ کیچڑ اور مٹی کس طرح اسکے دونوں کناروں سے ہم آغوشی کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اگر یہ نہر اپنی پوری ملبائی کے دوران اپنی موجودہ زیریں سطح سے ایک فٹ بھی گہری ہو تو تصور میں لائیے کہ یہ پانی کا کتنا بڑا ریلا اپنے ساحلوں میں سنبھال سکتی ہے۔ یہی حال راوی اور دوسرے دریاؤں کا ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے کہ جب تک بہتا ہوا پانی ساحلوں کے اندر رہتا ہے یہ انسان کے لئے بے انتہا کارآمد رہتا ہے اور انسانی زندگی کا سہارا بنتا ہے لیکن جونہی یہ ان ساحلوں کی حد بندیوں سے باہر نکلتا ہے تو انسان اور اس کی جملہ متاعِ زیست کی ہلاکت و بربادی کا سیلابِ بلاخیز بن جاتا ہے۔ مغربی ممالک اپنے دریاؤں اور نہروں کی تہوں (BEDS) کو مستقلاً کھودتے، EXCAVATE کرتے رہتے ہیں اور یوں ان میں بہنے والا پانی ہمیشہ اپنے ساحلوں کے اندر رواں دواں رہتے ہوئے ان کے لئے زیست آفریں بنا رہتا ہے۔ وہ اپنے ان منصوبوں (PROJECTS) پر لاکھوں کروڑوں روپے سالانہ خرچ کرتے ہیں لیکن یہ خرچ اس نقصان کے سامنے پرِ کاہ جتنی قیمت بھی نہیں رکھتا جو اُس سیلابِ بے پناہ سے ہوتا ہے جب یہی پانی ساحل ناآشنا ہو جائے ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آنے والے ارباب نے کبھی خود کوئی ایسا منصوبہ نہیں بنایا بلکہ جب عامۃ الناس اپنی ضرورتوں کے تحت دریاؤں اور نہروں کی تہوں سے، ریت اور مٹی نکالنا چاہتے ہیں تو انہیں بھاری رقوم ادا کرنا پڑتی ہیں اور بعض اوقات عقوبت بھی برداشت کرنا پڑتی ہے کاش انہیں کوئی اتنا سمجھا دے کہ اگر یہ عوام کو ہی کھلی چھٹی دے دیں کہ جاؤ اپنی ضرورتوں کے مطابق دریاؤں اور نہروں سے ریت اور مٹی لے لو تو یہ لوگ حکومت کی عدم توجہی کے شکار اس مسئلہ کو کتنی آسانی سے حل کر دیں اور یہی دریا اور نہریں پانی کی طغیانیوں کو کامیابی کے ساتھ اپنے ساحلوں کے اندر سمو سکیں رہے کوئی جو سیلاب سے تباہ ہونے والے انسانوں کی بحالی اور آبادکاری کے لئے اربوں روپیہ خرچ کرنے والے ان ارباب اقتدار کو یہ سادہ سی بات سمجھا سکے؟ یاد رکھئے جب جرائم قومی شکل اختیار کر جائیں تو ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تباہی بھی پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

اب میں حاضرینِ محترم! آپ کی توجہ ایک ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو بڑا ہی نازک ہے اور جس پر جذبات سے الگ ہٹ کر گہرے غور و فکر اور تدبر و حکمت سے کام لیتے ہوئے اسکا علاج ڈھونڈنے کی شدید ضرورت ہے!

ہمارے وطنِ عزیز کا سابقہ مشرقی حصہ جو اب بنگلہ دیش کہلاتا ہے، ہمارے دشمنوں کی سازشوں اور ہماری غفلت و لاپرواہی سے ہم سے الگ کر دیا گیا۔ وہاں پر ہندو اُن کی اپنی زبان، بنگالی میں، انہیں سال ہا سال

ہمارے خلاف بدگمان کرتا رہا اور ان کے دلوں میں ہر طرح کی بدظنی اور بد اعتمادی پیدا کرتا رہا ہم اپنی دلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں ان کی بدگمانیوں اور بدظنیوں کو دُور کرنے کی کوششیں کرتے رہے لیکن ظاہر ہے کہ جہاں ان بدگمانیوں کو ایک ایسے ذریعۂ ابلاغ ---- سے پھیلایا جا رہا تھا جو وہاں کے غیر تعلیم یافتہ باشندے بھی بآسانی سمجھ سکتے تھے، وہاں اُن کا سدِّباب ایک ایسے ذریعۂ رابطہ اور زبان میں کیا جا رہا تھا جسے وہاں کی قلیل آبادی بھی کما حقہٗ سمجھ نہ سکتی تھی تو ہماری اُن مصلحانہ کوششوں کا کیا نتیجہ نکلتا؟ محترم پرویزؔ صاحب نے ۱۹۵۳ء میں مشرقی پاکستان کا دورہ کر کے باہمی رابطہ و اتصال میں پیدا ہونیوالے تنگاف (COMMUNICATION GAP) کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے لازمی نتائج سے آگاہ کر دیا تھا جسے کسی نے قابلِ التفات و اعتنا نہ سمجھا۔ نتیجتاً یہ (COMMUNICATION GAP) بڑھتا رہا اور ہمارے بنگالی بھائی روز افزوں ہم سے بدگمان ہوتے اور دُور کھنچتے چلے گئے اور آخر کار دشمن کی ایک ہی ضربِ کاری ثابت ہوئی اور وہ ہم سے ٹوٹ کر یوں الگ ہو گئے کہ جیسے ہم کبھی ایک نہ تھے۔

یہی صورت حال اب ہمارے سندھی بھائیوں اور سرحدی بھائیوں کے سامنے ہے وہاں بھی ہمارے دشمن بعینہٖ وہی حربے اختیار کر رہے ہیں جو انہوں نے مشرقی پاکستان میں کامیابی کے ساتھ آزمائے اور ہم عقل کے دشمن پھر اپنا وہی پرانا وسیلۂ رابطہ اختیار کرتے ہوئے اُن کی سمجھ میں آنے والی زبان کی بجائے ان کے خدشات اور بدگمانیوں کو ایسی زبان میں دور کرنے کی سعیٔ لاحاصل میں مصروف ہیں جسے ان صوبوں کی اکثر آبادی نہیں سمجھتی۔ اس کا نتیجہ ابھی سے ہمارے سامنے آنے لگا ہے۔ سندھ میں بالخصوص لسانی گروہ تشکیل پا کر مقامی بھائیوں سے برسرِ پیکار ہیں اور سرحد میں کالا باغ ڈیم جیسے اہم منصوبے کے خلاف جو قومی معیشت کے لئے جسم کے خون کی سی حیثیت رکھتا ہے، روز بروز مزاحمت بڑھ رہی ہے۔ اور یہ دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ اگر اسے اُن کی مرضی کے خلاف بنایا گیا تو وہ اسے بم سے اُڑا دیں گے اور ہمارے سندھی بھائی بھی ان کی ہمنوائی میں رطب اللسان ہیں۔

ان حالات کے پیشِ نظر اس امر کی شدید ترین ضرورت ہے کہ اربابِ اقتدار سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایسے ذرائع اختیار کریں جن سے پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کے حسین امتزاج سے ایک ایسی قومی زبان تشکیل دی جائے جسے پاکستانی قوم فخر سے اپنی زبان کہہ سکے اور جس میں اظہارِ بیان، ہر دوسرے پاکستانی بھائی کی سمجھ میں آسکے۔

ذرا اُردو زبان کی اپنی تاریخ کو سامنے لائیے کہ یہ زبان کیونکر اور کس لئے بنائی گئی۔ اُردو کے لغوی معنی لشکر کے ہیں اور اصطلاحاً یہ اس زبان کے نام کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو ابتداءً ہندوستان میں مختلف زبانوں سے مل کر بنی اور جسے اُن دنوں لشکری زبان کہا جاتا تھا۔ ایسی زبان کی ضرورت ہندوستان میں اُس

وقت پیش آئی تھی جب مسلمان بادشاہوں کے دور میں ملک گیر سطح پر باقاعدہ فوج بنائی گئی اور اس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ بھرتی ہوئے۔ انہیں ایک دوسرے سے روزمرہ گفتگو اور رابطہ کی دشواریاں پیش آئیں اور اپنی دشواریوں کے پیش نظر انہوں نے ایک ایسی زبان کی تشکیل کی جو نہ صرف پنجابی ہندی پشتو، سندھی، ملیالی۔ گجراتی اور دیگر علاقائی زبانوں کے امتزاج سے بنی تھی بلکہ اس نے اپنے اندر عربی فارسی، ترکی اور بعد میں انگریزی کے الفاظ بھی سمو لئے تھے۔ اگر قدیم ہندوستان میں جو ہمارے پاکستان سے کہیں زیادہ وسیع و عریض تھا مختلف علاقوں میں بسنے والے باشندوں کے لئے ایک ایسی زبان تیار کی جا سکتی تھی جسے ہر علاقے کے لوگ اپنی سمجھیں اور اس میں برابر کی سہولت اور آسانی سے اظہارِ خیال کر سکیں تو نسبتاً کم علاقہ مملکت میں ایک ایسی زبان کیوں بنائی نہیں جا سکتی جسے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد میں رہنے والے اپنی زبان کہہ سکیں۔ اور جسے پاکستان کی قومی زبان کہا جا سکے۔ مملکتِ پاکستان کے خزینہ پر پلنے والے ایک سفید ہاتھی مقتدرہ قومی زبان کا یہی فریضہ تھا نہ کہ دلی اور لکھنو کی ٹکسالوں میں گھڑی ہوئی اس اردو زبان کی بقا اور فروغ جو پاکستان کے کسی وسیع تر علاقہ میں بولی اور پورے طور پر سمجھی نہیں جاتی ۔۔۔۔۔ قائداعظمؒ نے جب یہ فرمایا تھا کہ ہماری قومی زبان اردو ہو گی تو اُن کا مقصود و مطلوب بھی ایک ایسی لشکری زبان تھا جو پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کے امتزاج سے تیار ہو۔

حاضرینِ محترم! یہ مملکت، اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ اقدار و قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے حاصل کی گئی تھی۔ ہم طالبعلمانِ قرآنِ کریم اسے اپنا مقدس فریضہ سمجھتے ہیں کہ اس مملکت کو ضعف پہنچانے والے ہر عنصر کا تجزیہ قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے اپنی بصیرت کے مطابق اس کے سدِباب کے ممکنہ ذرائع کی نشاندہی بھی کر دیں۔ ہم سنتِ نبویؐ کے تتبع میں صرف اسی حد تک مکلف ہیں۔ اس سے آگے اربابِ اقتدار کا کام ہے کہ وہ ان عناصر کے سدِباب کے لئے عملی قدم اُٹھائیں۔ اگر اربابِ اقتدار کی طرف سے حسبِ سابق غفلت برتی گئی اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں پیدا ہونے والے رابطہ کے اس شگاف (COMMUNICATION CAP) کو پُر کرنے کے لئے فوری عملی اقدامات نہ کئے گئے تو خاکم بدہن یہاں بھی آخر کار وہی نتیجہ نکلے گا جو مشرقی پاکستان میں برآمد ہوا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آنے والی تاریخ اس کا امتیاز نہیں کرے گی کہ اسے لانے کا کون ذمہ دار ہے اور کون نہیں لیکن کم از کم ہم اللہ تعالیٰ کے حضور اتنا تو کہہ سکیں گے کہ بارِ الٰہا تیری اس بے پایاں عنایت مملکت پاکستان کے تحفظ و استحکام کے لئے ہم جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ہم میں قدرت نہ تھی۔

ہماری قومی زندگی کا ابھی ایک المیہ اور باقی ہے۔ ہماری حکومتوں کی طرف سے قومی ترقی کے لئے

منصوبے بنائے جاتے ہیں، اُن پر عمل درآمد کیا جاتا ہے اور اُن کی مدتِ عمل ختم ہونے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ہم وہیں کے وہیں کھڑے ہیں جہاں سے ہم نے آغازِ سفر کیا تھا۔ یا شاید اُس سے ذرا آگے سرکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان کو وجود میں آئے اکتالیس سال ہو چکے ہیں لیکن اس مملکت میں بسنے والے غریب عوام اور معدودے چند اصحابِ دولت میں موجود تفاوت اور دوری نہ صرف ختم نہیں ہوتی بلکہ وسیع تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کی ہم کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ دراصل اس کی وجہ سمجھنے کے لئے کسی طول طویل بحث و تمحیص اور تحقیق و تدقیق کی ضرورت نہیں۔ ہمارے تمام ترقیاتی منصوبے یا تو ورلڈ بنک کی ٹکسال میں گھڑے جاتے ہیں یا اقوامِ مغرب بالخصوص امریکہ کے نقشہ گری کے ایوانوں میں۔ ورلڈ بنک ہو، یا اقوامِ مغرب، منصوبہ بندی کرنے والے ماہرین کی اکثریت یہودی ہے۔ وہ جو منصوبے بھی بناتے ہیں اپنے مفاد کے پیشِ نظر بناتے ہیں اور اُسے ہر قیمت پر حاصل کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ترقی پذیر ممالک میں نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ترقی نظر نہیں آتی بلکہ وہ روز بروز بڑھتے ہوئے قرضوں کے بوجھ تلے دبتے چلے جاتے ہیں۔ اور جتنا زیادہ یہ یہودی سود خور کے قرضوں تلے دبتے ہیں اتنا ہی اس کے لئے ان ممالک کے استحصال کے امکانات اور زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کے ایک ایک گوشہ پر نظر دوڑائیے اور کوشش کیجئے کہ کسی ایسی تنظیم یا ادارے کی نشاندہی ہو سکے جو ملکی و ملّی مفادات میں کام کر رہا ہو۔ ہماری تعلیم، ہماری معیشت، ہماری معاشرت، ہماری تجارت ہماری برآمدات اور درآمدات سب یہودِ چالاک کی کھینچی ہوئی تصویریں ہیں اور ان ہی کے مفادات کی خدمت میں سرگرمِ عمل۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم کے بہی خواہ سائنس دان، انجینئر اور منصوبہ بندی کے ماہرین خود ایسے منصوبے تیار کریں جو ہماری اپنی ضروریات بھی پوری کریں اور ہمارے مفادات کے حصول و تحفظ کا ذریعہ بھی بنیں۔ جب تک ہم ایسا نہیں کرتے ہم اپنی قومی اور بین الاقوامی زندگی میں ایسی پتلیاں بنے رہیں گے جن کی ڈوریں یہودیوں کے ہاتھ میں ہوں اور وہ جس طرح چاہیں اِن تاروں کو کھینچ اور ڈھیلا چھوڑ کر ہم سے رقص کروا سکیں۔ ہماری داخلی پالیسیاں، خارجہ پالیسیاں، تجارتی معاشی اور مالی پالیسیاں ہمارے اپنے ذہنوں کی تخلیق ہونا چاہئیں اور اُن کے برآمدہ نتائج ہماری اپنی سعی و عمل کا ثمر۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس پر گامزن ہو کر ہم اپنی تاریخ کے اس دور سے محفوظ اور کامران نکل سکتے ہیں جس میں ہم ہر طرف سے یہودیوں کے پھیلائے دام ہائے ہمرنگِ زمین میں گھرے ہوئے ہیں۔

محترم سامعین! اب میں آپ کی توجہ اپنی قومی زندگی کے ایک اور بڑے افسوسناک گوشہ کی طرف مبذول

کرانا چاہتا ہوں۔ آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ یہ مملکت، قائد اعظمؒ کے اپنے الفاظ میں "قرآنی اقدار و قوانین کے نفاذ کے لیے" حاصل کی گئی تھی۔ اور اس مملکت کی تصویر پیش کرتے ہوئے مفکرِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ:۔

"اس سے اسلام، اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا"

قائد اعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران یہ فرمایا تھا کہ مسلم لیگ نے کم از کم یہ تو کر دیا ہے کہ قوم کے سر سے ملّا کی تنگ نظری اور اس کے تعصّب کا کابوس اتار کر رکھ دیا ہے۔ لیکن اسی اقبالؒ اور اسی قائد اعظمؒ کے نام کا وِرد کرنے والے انہی کے دیئے ہوئے خطوط کے مطابق پاکستان کے لیے نظامِ مملکت وضع کرنے کے دعوے کرنے والے حکمرانوں نے ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیلے اور بالخصوص پچھلے گیارہ سال میں جس طرح قومی زندگی کے ہر شعبے پر ملّا کو مسلّط کیا گیا اس کی تفصیل میں جانے کی مجھے ضرورت نہیں کیونکہ ہم سب اسی ماحول کے باسی اور اس کے زہریلے اثرات کے ڈسے ہوئے ہیں۔ شریعت کے نفاذ کے نام پر مسلمانوں کی مختلف فرقوں میں تقسیم کو مستحکم کیا گیا اور قرآنِ کریم کی تشریح و تعبیر کو ان فرقوں کے رہنماؤں کے اپنے خیالات و عقائد کے تابع رکھا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحاقہ میں قرآنِ کریم کے مُنزّل من اللہ ہونے کے تذکرہ کے بعد فرمایا ہے کہ:۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ (۶۹/۴۴-۴۶)

اگر یہ (رسولِ کریم) اپنی طرف سے کچھ باتیں بنا کر انہیں ہماری طرف منسوب کر دے تو اسے ہم داہنے ہاتھ کی محکم گرفت سے پکڑ لیں اور اس کی رگِ حیات کاٹ کر رکھ دیں۔

غور کیجئے کہ اللہ اپنے رسولؐ کو، اپنی طرف سے اللہ کے ساتھ ایسی باتیں منسوب کرنے پر جو اس نے بذریعہ وحی نہیں کہیں، اس قسم کی شدید گرفت اور عبرتناک انجام کا انذار دیتا ہے تو ذاتِ رسالتمآب کے بعد ایسا کرنیوالوں کا انجام کس قدر عبرتناک ہو سکتا ہے؟ اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسے لوگوں کا کیا انجام ہوا!

اللہ کی کتاب کے ساتھ من مانے کھیل کھیلنے اور اس طرح اپنی دکانداریوں کو چمکانے والوں کو سبق سیکھنا چاہیئے کیونکہ اللہ کی گرفت تو ایسی شدید ہے کہ جب وہ وقفۂ مہلت کے بعد نافذ ہو جاتی ہے تو اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ اور ایسا کرنے والے بھک سے اُڑ جاتے ہیں۔

اب انتخابات سر پر آ رہے ہیں اور جیسا کہ میں نے آپ احباب سے اسی سال ماہِ جون کی سب کنونشن میں عرض کیا تھا کہ جہاں سیاسی اور مذہبی جماعتیں ان انتخابات میں اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کریں گی جس سے ان کی مطلب براری ہو، وہیں آپ، طالبعلمانِ قرآنِ کریم کی ذمہ داریاں دُہری ہو جاتی ہیں۔ اوّلاً اس دوران آپ اپنی تبلیغی مساعی کو تیز تر کریں تاکہ قوم کے سامنے قرآنی نظامِ حیات کا نقشہ واضح ہو کر اور اُبھر کر آ جائے اور ثانیاً آپ کی طرف سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو یا کوئی ایسا قدم نہ اُٹھے جس سے تحفظ و استحکام پاکستان پر کسی قسم کی زد پڑتی ہو۔ اس لیے کہ ہماری درخشندہ آرزوئیں اور تابناک امیدیں اسی خطۂ زمین سے وابستہ ہیں۔ اور ہم جس جنتی معاشرہ کے قیام کے لیے تگ و دَو کر رہے ہیں اس کی عملی تشکیل اسی سرزمین میں ہو سکے گی۔ آپ اس دوران ایسے اُمیدواروں سے تعاون کریں جو اللہ کی اطاعت اور اس کی کتاب کی سرفرازی کا دعوا لے کر اٹھیں اور آپ اپنے ذاتی علم کی حد تک مطمئن ہوں کہ وہ ایسا کرنے میں دیانت دار ہیں۔ اس دوران آپ کسی ایسی بات کو موضوعِ بحث نہ بننے دیں جو ملکی سالمیت کے خلاف جاتی ہو۔ مختصراً آپ کا انتخابات کے دوران بالخصوص مجموعی کردار اس تعلیم کا آئینہ دار ہونا چاہیئے جو آپ قرآنِ کریم سے حاصل کرتے اور دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ہماری تحریک جو کچھ کرتی ہے وہ چونکہ قرآنِ کریم ہی کی تعلیم ہے اس لیے زود یا بدیر وہ یقیناً اپنے اثرات مرتّب کر کے رہے گی۔ ہو نہیں سکتا کہ زمانہ اسے قبول نہ کرے۔ آپکا فریضہ صرف اس آواز کو دوسروں تک پہنچا دینا اور اپنے عملی کردار کو اس رنگ میں رنگتے چلے جانا ہے اور ہم اسی کے مکلّف ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے یہ فرما دیا تھا کہ:۔

..... فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ○ (۱۳/۴۰)

آپ اس عزم کے ساتھ مصروفِ عمل رہیئے کہ۔

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کر کے رہیں گے

اللہ کی کائناتی قوتیں آپ کے ساتھ رہیں گی۔

وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ

محمد عمر دراز

مرتبہ : محمد اسلام
از کراچی
۲۳ ستمبر ۱۹۸۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریک پاکستان اور پرویزؒ صاحب

۱۹-۱۹۱۸ء میں ہندوستان میں اس تحریک کی ابتداء ہوئی جسے بظاہر جنگ آزادی کا نام دیا گیا لیکن جو بباطن اس ملک میں ہندو راج کے قیام کے منصوبوں پر مبنی تھی۔ سابرمتی کے گؤسالہ پرست سامری کی نگہ باریک بیں نے مسلمانوں کی فطرتِ سیمابیت کو بھانپا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر سوچی۔ مسلمان مذہب کے نام پر مستانہ وار اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تحریک کا دامن تحریکِ خلافت کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر کیا تھا، مسلمان بگولے کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا اور ہندوستان کے طول و عرض میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ ۱۹-۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۸ء تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ ایک حرکت تھی بلا مقصد، ایک سفر تھا لیکن بلا تعیّنِ منزل۔ اس کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ تمام جوش و خروش، یہ وجد و رقص بالآخر ہے کس لئے۔ "چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر ایک تیز رَو کے ساتھ"۔

محترم غلام احمد پرویزؒ صاحب ۱۹۳۰ء کے پاکستانی تھے۔ یہ اس دَور کی بات ہے جب الہٰ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں علّامہ اقبالؒ نے مسلمانانِ ہند کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھا۔ اس نصب العین کے اصول و مبانی جن سے اس نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہ تھے کہ :-

(۱) اسلام کی رُو سے قومیّت کا مدار مذہب پر ہے۔ جغرافیائی حدود، وطن کی چار دیواری، زبان اور نسل کا اختلاف سب غیر فطری امتیازات ہیں۔ نوعِ بشری کی تقسیم صرف ایک معیار پر ہو سکتی ہے — یعنی وہ تمام لوگ جو نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کا عہد کریں، ایک قوم کے افراد اور ان کے علاوہ تمام انسان دوسری قوم کے افراد۔ اسی کا نام ایمان اور کفر ہے۔ اسی تقسیم کو قرآن نے حزب اللہ اور حزب الشیطان کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) اس معیارِ تقسیم کی رُو سے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ایک جداگانہ مستقل قوم کے افراد ہیں۔ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم کسی طرح نہیں بن سکتے۔

(۳) مسلمانوں کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں کہ غیر ملک کے حکام (انگریز) یہاں سے نکل جائیں اور ان کی جگہ یہاں کی ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ ان کے نزدیک یہ بھی اسی طرح کی غلامی ہو گی جس طرح انگریز کی حکومت ان کے لئے غلامی ہے۔ آزادی سے ان کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اپنے تصورات و معتقدات کے مطابق زندگی بسر کرنے پر قدرت رکھیں اور دنیا میں قرآنی نظام رائج کر سکیں۔

(۴) یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان کا ایک مستقل مسکن (HOME LAND) ہو کیونکہ ہر دولتی نظام کے لئے زمین کا ہونا لازمی ہے۔

(۵) ہندوستان کی موجودہ شکل میں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ مغربی اور مشرقی علاقوں میں جہاں حسن اتفاق سے مسلمانوں کی اکثریت ہے، ان کی الگ اور قائم بالذات حکومت قائم ہو جائے۔ اسی کا نام تقسیم ہند ہے۔

جوش و خروش کے اس دور میں مسلمانوں نے اس نصب العین کو شاعر کا خواب سمجھ کر سنی ان سنی کر دی لیکن ہندو نے جسے آزادی سے زیادہ مسلمان پر حکومت کرنے کا شوق چرا رہا تھا اسکا سختی سے نوٹس لیا اور مسلمانوں کے اس حق و عدل پر مبنی دعوے کی مخالفت شروع کر دی۔ چونکہ مسلمانوں کے ان تمام دعاوی و مطالبات کا مدار اس بنیاد پر تھا کہ مذہب کی رو سے وہ ایک الگ قوم ہیں، انہوں نے یہ چلانا شروع کر دیا کہ مذہب ایک نجی 'PRIVATE' عقیدہ کا نام ہے جسے سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہندوؤں کی طرف سے تو یہ مخالفت ہونی ہی تھی لیکن ہماری بدقسمتی کہ خود مسلمانوں میں سے ایسے لوگ بھی انہیں مل گئے جو مسلمانوں کے ان مطالبات کی مخالفت میں ان کے ہمنوا ہو گئے۔ ہمنوا ہی نہیں بلکہ ان کے آلات مکبر الصوت 'LOUD SPEAKERS' بن گئے۔ آنے والے مؤرخ کے لئے یہ منظر بھی حیرت و استعجاب کی عجیب کیفیات پیدا کرے گا کہ مسلمانوں کے اس دعوے کی وکالت کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جسے امور دینیہ کے عالم ہونے کا کبھی دعویٰ نہ ہوا۔ اور اس کی مخالفت میں وہ گروہ پیش پیش تھا جو اپنے آپ کو "حاملانِ دینِ مبین اور مفتیانِ شرعِ متین" کے القابات سے متعارف کراتا تھا۔

ہندو کے عزائم

جب ملک سے انگریز کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی تو ہندو کے سینے میں چھپے عزائم رفتہ رفتہ بے نقاب ہونے لگے۔ اس کی سکیم یہ تھی کہ انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد، ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد کو ایک قوم فرض کر کے

یہاں جمہوری انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ جمہوری انداز حکومت میں سارا اقتدار اور اختیار، اکثریت کے ہاتھوں میں رہتا ہے اور اقلیت کو ان کے رحم وکرم پر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں :-

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا دھمکا کر اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔" (میری کہانی۔ جلد دوم صہ ۴۵۵)

لہٰذا، ہندو کی اسکیم کی رُو سے، ہندوستان میں جمہوری حکومت کے معنی یہ تھے کہ یہاں مسلمان مستقلاً اور دائماً ہندوؤں کے محکوم رہیں۔ یہ اسکیم اس مفروضہ پر مبنی تھی کہ ہندوستان کے تمام باشندے محض ایک ملک میں بسنے کی وجہ سے، ایک قوم ہیں۔ قرآن کی رُو سے یہ مفروضہ ہی غلط تھا۔ وہ قومیت کی تشکیل، وطن کے اشتراک کی رُو سے نہیں کرتا، بلکہ آئیڈیالوجی کے اشتراک کی رُو سے کرتا ہے۔ اس کے اس اصول کی صورت ——— یہ تھی کہ مکّہ کا رہنے والا ابوجہل (جو نہ صرف اس وطن کا باشندہ تھا جس میں محمد رسول اللہؐ رہتے تھے بلکہ رنگ، نسل، زبان کے لحاظ سے بھی انہیں میں سے تھا۔) ایک دوسری قوم کا فرد تھا اور روم کا صہیبؓ، حبش کا بلالؓ اور فارس کا سلمانؓ ایمان کے اشتراک کی بناء پر قرآنی اُمّت کے افراد۔ وطن، رنگ، نسل، زبان کا اشتراک ابوجہل اور ابوبکرؓ کو ایک قوم کے افراد نہیں بنا سکتا تھا۔ یہ تھا وہ معیارِ قومیت جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا۔ قائداعظمؒ نے اس حقیقت کو پیش کیا تو ہندو کے قصرِ سیاست میں زلزلہ آگیا۔ اس لئے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد، اس کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا جس کی رُو سے وہ اپنی ہزار سال کی غلامی کا انتقام مسلمانوں سے لینا چاہتا تھا۔ یہ تھا وہ پہلا محاذ جس پر قائداعظمؒ کو آزادی کی جنگ لڑنی پڑی۔ انہوں نے یہ آواز بلند کی تو چاروں طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مارچ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں کہا:-

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔"

پھر انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا:-

"مسلم قومیت کا تخیل چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔"

دوسری طرف سے مہاتما گاندھی نے پکارا کہ :-

"میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا، تو اسلام کے بعد اسے ایک ہی قوم رہنا چاہئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔"

(گاندھی کا خط جناح کے نام مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء)

نیشنلسٹ مسلمان

ہندوؤں نے تو یہ کچھ کہنا ہی تھا اس لئے کہ ان کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے اور رام راج کا خواب، پریشان ہوتا نظر آتا تھا۔ لیکن حیرت اس پر تھی کہ خود مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد بھی اس باب میں ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ انہیں اس زمانے میں نیشنلسٹ مسلمان کہا جاتا تھا جنمیں جمعیتِ علماءِ ہند۔ سرحد کے سرخپوش، مجلس احرار۔ بہار کے انصار۔ جماعتِ اسلامی وغیرہ سب شامل تھے اور قائداعظمؒ کے اس مطالبہ کے خلاف، ہندوؤں کی فوج کے ہراول دستے کے طور میدانِ کارزار میں اُتر آئے تھے چنانچہ صوبہ بہار کے اس زمانے کے وزیر، ڈاکٹر سید محمود نے یہاں تک کہہ دیا کہ :-

"لفظِ ہندی کو، ہندی زبان کے لئے نہیں بلکہ اہلِ ہند کے لئے اختیار کرنا چاہئے۔ دُنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایسا ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب کی رُو سے شناخت میں آتے ہیں۔ اس سے ہماری دماغی کیفیت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے اور ہمارے متعلق یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برّاعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کر لیں۔"

یعنی اُن کی تجویز یہ تھی کہ مسلمان (الگ قوم بننا تو ایک طرف) اپنے آپ کو الگ نام (مسلمان) سے بھی نہ پکاریں، یہ اپنے آپ کو صرف ہندی کہیں۔ حتیٰ کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے یہاں تک کہہ دیا کہ قومیں مذہب سے نہیں اوطان سے بنتی ہیں۔

غرضیکہ میدانِ سیاست میں چاروں طرف سے اس طرح کے حملے ہو رہے تھے اور قائداعظمؒ (علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد) یکہ و تنہا ان تمام حملوں کا جواب دے رہے تھے اور مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ نیشنلزم کا یہ تصور ہندوستان میں انگریز کا جاری کردہ ہے جسے ہندو نے اپنی خاص مصلحت کے ماتحت اپنا لیا تھا۔ یہ نظریہ اسلام کے یکسر خلاف ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کو تباہ و برباد کر دینے کا موجب۔ لیکن اس

کے باوجود مخالفت مسلسل اور بدستور جاری تھی۔

قائدِ اعظمؒ بساطِ سیاست پر اپنے مدِّ مقابل کے مہروں کو مات دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے تدبّر اور فراست نے دشمنوں پر ایک تہلکہ سا ضرور بٹھا دیا تھا لیکن ایک محاذ ایسا بھی تھا جو قائدِ اعظمؒ کے بس کا نہ تھا۔ یہ محاذ تھا ان مخالفین کی مدافعت کا جو قال اللہ اور قال الرسولؐ کے نقاب میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں مقابلہ مذہبی پیشوائیت کے ان مُہروں سے تھا جنہیں جبّہ و دستار کے تقدس میں دشمن اپنا آلۂ کار بنا کر آگے بڑھا چکا تھا اور یہ "مفتیانِ شرعِ متین" خوفِ خدا اور تقاضائے ایمان و دین سے بے نیاز ہو کر یہ فتوے صادر فرما رہے تھے کہ وارد ھا آشرم کے مہاتما اور آنند بھون کے پنڈت بروئے شریعت ہمارے سیاسی امام قرار پا سکتے ہیں۔ کیونکہ سیاست کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے اور ملکی سیاست اور آزادی کی جدّوجہد ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر مشتمل متحدہ قومیّت کا مسئلہ۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا اجراء

ہماری تاریخ کا یہی وہ نازک مرحلہ تھا جہاں تحریکِ قرآنی کے داعی محترم پرویزؒ صاحب قائدِ اعظمؒ کی مدد کے لئے آگے بڑھے اور طلوعِ اسلام فکرِ قرآنی کی شمعِ درخشندہ کو تھامے ہوئے معرکۂ دین و وطن کی رزمگاہ میں جلوہ بار ہوا۔ اس نے مذہب کے نام پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف جس جوش و خروش سے اور اثبات و استقامت کے ساتھ جو مکتی لڑائی لڑی اس پر اس زمانے کے فائل شاہد ہیں۔ پرویزؒ صاحب اس زمانے میں حکومتِ ہند کے مرکزی سیکرٹریٹ میں ملازم تھے لیکن اس کے باوجود کیفیت یہ تھی کہ وہ دن میں دفتر ہوتے تو شام کو قائدِ اعظمؒ کی کوٹھی پر۔ خود ان کا اپنا مکان، تحریکِ پاکستان کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ پیر علی محمد راشدی (مرحوم) نے جو لکھا تھا کہ سرکاری افسروں میں صرف تین ایسے تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں پوری تن دہی اور گرمجوشی سے حصّہ لیا اور ان تین میں ایک پرویزؒ صاحب تھے، تو یہ امرِ واقعہ ہے۔

تقسیمِ ہند سے قبل طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید دورِ حاضرہ کی اصطلاح یا مفہوم میں ایک "سیاسی مقصد" کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ طلوعِ اسلام کا مؤقف قرآنی تصوّر کی ہمنوائی میں یہ تھا کہ اسلام ایک دین (یعنی نظامِ مملکت) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اقدار کی حکمرانی ہو۔ اسطرح یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزین کرتا چلا گیا کہ

اسلام کا مقصود کیا ہے اور دین کا مطمح نگاہ کیا۔ وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے اور وہ ضابطہ یا نظام کس طرح دیگر نظام ہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کر سکتا اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔

ماہنامہ طلوع اسلام کا پہلا شمارہ ۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا تھا لیکن انتظامی سہولت کی خاطر اسے ماہ مئی کا پرچہ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے پیش کش اور افتتاحیہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کی ذات گرامی اور حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ساتھ اس کے کیا معنوی تعلقات وابستہ تھے۔ اس کے اغراض و مقاصد ہندوستان کی سیاسی اور اجتماعی کشاکش میں "اسلامی رائے" کی ترجمانی تھا۔ طلوع اسلام کے پہلے شمارہ میں محترم پرویزؒ صاحب کے دو مضامین بہ عنوان "دین فطرت" اور "نظریہ قومیت" شائع ہوئے۔

دینِ فطرت

میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ تنہا عقلِ انسانی مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکتی۔ اسے اپنی راہ نمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اس لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

نظریۂ قومیت

سیاسی کشمکش کے دور میں سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نظریۂ قومیت تھا۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں اس نظریہ سے متعلق ایک بحث کا سلسلہ چھڑا۔ بات یوں ہوئی کہ "مولانا حسین احمد مدنی صاحب شیخ الحدیث، دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ "اس زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں بنتیں"۔ چونکہ یہ نظریہ اسلام کے شجرِ طیب کی جڑ کو کاٹنے کے مترادف تھا۔ اور پیش ہو رہا تھا ایسے گوشے سے جسے مسلمانوں کی دینی تعلیم کی مرکزی حیثیت حاصل تھی، طلوع اسلام نے اس کے جواب میں قرآن کریم کے نظریۂ قومیت کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جسکا جواب کسی سے نہ بن پڑا، اور یہ صدقہ تھا محترم پرویزؒ صاحب کی قرآنی بصیرت کا جو اژدھا بن کر ان سامریوں کے بچھڑے کو نگل گیا اور اس سے قائداعظمؒ کو بڑی تقویت پہنچی۔

واردھا کی تعلیمی اسکیم

تاریخ عالم کے زمانۂ قدیم پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت و سطوت کی مالک قومیں دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قتل و غارت گری اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں۔ چنگیز و ہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحاتِ تاریخ

[illegible] کے حروف سے لکھی ملتی ہیں۔ فرعون و نمرود، شداد و ہامان کے جور و استبداد کے واقعات [illegible] جسم میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دورِ جہالت تھا۔ اعلانیہ سبعیت و بربریت کا زمانہ تھا۔ عصرِ حاضر [illegible] انسان اس دورِ وحشت کو سخت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اپنے زمانہ کو [illegible] و برکتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں جنہیں [illegible] انسانیت تڑپ اٹھی، بلکتی، پھڑکتی نظر آئے لیکن جو لوگ حقائق اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں ان [illegible] حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت اور بربادی میں [illegible] جہالت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عہدِ جہالت تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہ سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کسطرح اصلاح و بہبود کے خوش آئیند نقاب اوڑھائے۔ وہ جو کچھ کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا۔ بتا کر، جتا کر، دکھا کر کرتا تھا۔ لیکن آج انسان عقل و حکمت میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ آج اسی طرح کھلم کھلا ہوسِ خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب سے زیادہ مدبر، سب سے زیادہ ہوشیار وہ ہے جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک نظر نہ پڑے۔ وہ دوسروں کی متاعِ حیات کو اس مشفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اس پر رہزن و قزاق ہونے کا شبہ تک نہ ہو۔ وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے، درایں حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ دورِ جہالت کا وحشی اور ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ اس کے جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفانِ بلاخیز ہیں جو کف بر دہان بڑھتا، امنڈتا، بپھرتا چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانیوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں اور جس کی شورانگیزیوں کو بہرے بھی سنتے ہیں لیکن دورِ حاضر کے مہذب انسان کی ابلیسانہ چالیں ایک پُرسکوت دریا کی مانند ہیں کہ جس کی روانیوں میں شور ہے نہ تموج، لیکن سطحِ آب کے نیچے ایسے ایسے خوفناک مگرمچھ چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو نگل جائیں۔ لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان سن سکیں۔

اس پُرسکوت طریقِ تخریب اور اس آتشِ خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل ہے۔ آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں، نہایت خاموشی سے اس کے طریقِ تعلیم کو بدل دیجئے۔ وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاکت و بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھنچی چلی جائے گی اور اسے پتہ اس وقت چلے گا جب وہ موت کی ہچکیاں لے رہی ہو گی۔

تعلیم کی یہ اہمیت، ہندو قوم کے سب سے بڑے راہنما گاندھی کے پیشِ نظر تھی۔ اس نے محسوس کیا مسلمانوں کی آئندہ نسلوں پر حکومت کرنا ممکن نہ ہو گا، جب تک ان کے ذہنی تصورات کو نہ بدل دیا جائے۔

اور اس کی آسان ترین شکل یہ ہے کہ ان کے نصاب تعلیم کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر ایک تعلیمی کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس نے شروع ۱۹۳۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس سکیم کا نام "وارودھا کی تعلیمی سکیم" تھا۔ اس سکیم میں ایسے ایسے زہریلے نشتر چھپا کر رکھے گئے تھے کہ اگر یہ خدانخواستہ کہیں مسلمانوں میں رائج ہو جاتی تو یہ نشتر ان کی آئندہ نسلوں کے رگ جان میں پیوست ہو جاتے۔ اگست ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام میں اس دام ہمرنگ زمین کا محترم پرویز صاحب نے اس وضاحت سے تجزیہ پیش کیا کہ ہندو کی خفیہ تدبیریں سب برباد ہو گئیں۔ ادارہ طلوع اسلام نے اپنے پیش نظر اسلوب اشاعت یہ رکھا تھا کہ اس قسم کے اہم مضامین کو الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا جاتا۔ چنانچہ اس مضمون کا پمفلٹ ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوئے۔ پشتو، گجراتی، ہندی، ملیالم، سندھی وغیرہ۔ اندازہ یہ ہے کہ اس مضمون کے قریب اسی ہزار پمفلٹس ملک میں تقسیم ہوئے اور نتیجہ اس نشر و اشاعت کا یہ ہوا کہ یہ سکیم بری طرح ناکام ہو کر رہ گئی۔

تعلیم بدلنے کے ساتھ ہی زبان بدلنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو مٹانے کے لئے جو پروگرام وضع کیا گیا تھا اس میں زبان کی غیر محسوس تبدیلی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ سیدھا سادہ مسلمان ان حسین فریبوں سے قطعاً ناآشنا تھا۔ اسے اس عظیم خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے اکتوبر ۱۹۴۸ء کے طلوع اسلام میں "زبان کا مسئلہ" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب کا ایک مفصل مقالہ شائع ہوا جس کی تمہید ان الفاظ سے ہوئی۔

زبان کا مسئلہ

"مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انہیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے۔ کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اس کا کیا تعلق ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قوم کو بنانے اور بگاڑنے میں، کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں کسی قوم کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں، زبان کا ایک غیر معمولی اثر ہوا کرتا ہے۔ جس قوم کے پاس، اپنی زبان، اپنا رسم الخط ہے، وہ ایک مستقل قوم ہے اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے، وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جس وقت وہ قوم اپنی زبان چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس وقت سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے، اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے، اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے، غیر محسوس طور پر تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھینچی جا رہی ہے۔ یہ ایک تنگ نظر مسلمان ہی کا خیال نہیں بلکہ "کشادہ ظرف" ہندو بھی اس کے مؤید ہیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں۔

ایک قوم کے لئے زبان کا مسئلہ بڑا اہم ہوتا ہے ۔ آج سے تین سو برس پیشتر ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو ، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیئے اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں ۔ کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجہ کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جا سکی ہو جس وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں ۔"

دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں :-

"رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو ۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں ، آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں ۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مُردہ ہو چکی ہے ۔"

(میری کہانی جلد اوّل ص۱۹۵)

ان الفاظ کو غور سے پڑھیئے اور انہیں دل کی گہرائیوں میں جگہ دیجئے کیونکہ اس مضمون میں ان کی طرف بار بار توجہ کرنی پڑے گی ۔

زبان کی اہمیت پر محترم پرویزؒ صاحب کا یہ بصیرت افروز مضمون اکتوبر ۱۹۳۸ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہوا ۔ اس مضمون کا پمفلٹ بھی بار بار چھپا اور اطراف و جوانب میں پھیل گیا ۔

عرضداشت بخدمت علماء کرام

اس سیاسی کشمکش کا سلسلہ یونہی جاری رہا ۔ ملتِ اسلامیہ کی اکثریت مسلمانوں کے جداگانہ قومیت اور الگ حکومت کے دعوے کی تائید میں تھی لیکن "قومیت پرست" گروہ ان کی مخالفت میں دن رات مصروفِ پیکار تھا ۔ اور عجیب یہ کہ اس مخالفت میں جمعیتِ علمائے ہند صفِ اوّل میں تھی ۔ آٹھ نو برس ہو چکے تھے، جمعیت کا سالانہ اجتماع نہیں ہوا تھا لیکن اس مخالفت کے جوش نے ان میں پھر سے حرکت پیدا کی اور اوائل مارچ میں دہلی میں ان کا اجتماع ہوا ۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور ایسے وقت میں مسلمانوں کے ملی مطالبہ کی مخالفت میں ایک ایسا اجتماع خاص اہمیت رکھتا تھا ۔ طلوعِ اسلام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اپنے غلط رَو

بھائیوں کو سیدھا راستہ دکھانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس اجتماع کی تقریب پر محترم پرویز صاحب نے ایک جامع مقالہ بعنوان "عرضداشت بخدمت علمائے کرام" تحریر کیا اور اس کا پمفلٹ شائع کر کے جلسے کے پہلے دن خاص اہتمام سے بلا قیمت تقسیم کیا۔ اللہ نے موصوف کی اس سعی کو بار آور فرمایا اور عوام اس فریب کا شکار ہونے سے بچ گئے جو اس معصوم انداز سے کھیلا جا رہا تھا۔

خدا کی بادشاہت

ماہنامہ طلوع اسلام کے ماہ مئی ۱۹۳۹ء کے شمارہ میں محترم پرویز صاحب نے "خدا کی بادشاہت" کے عنوان سے نظامِ حکومت کے موضوع پر عصرِ قدیم سے عصرِ جدید تک کا جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ، ہندو اسلامی نظامِ حکومت کی اتنی شدت سے کیوں مخالفت کرتا ہے۔ موصوف نے لکھا:-

"جمہوریت ہو یا آمریت، زمانۂ قدیم ہو یا عصرِ حاضر، نظامِ حکومت کی بناء اس پر قائم ہے کہ صاحبِ اقتدار کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی منشاء کے مطابق قانون بنائے اور دوسروں سے ان قوانین کی اطاعت کرائے۔ جمہوریت میں اکیاون (۵۱) کی اکثریت کو حق حاصل ہے کہ وہ انچاس (۴۹) کی اقلیت سے اپنا فیصلہ بہ جبر منوائے ... جمہوریت ہو یا آمریت، جماعتی حکومت ہو یا شخصی، انسان نے ہر اندازِ حکومت سے ابا کیا ہے اس لئے کہ ہر طرزِ حکومت کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی جاتی ہے کہ بعض انسانوں کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ حالانکہ یہ بنیاد ہی غلط ہے اور چونکہ خلافِ شرفِ انسانیت ہے اس لئے انسان غیر محسوس اور شعوری طور پر اس کے خلاف اپنے سینے میں بغاوت کے جذبات موجود پاتا ہے ....

آج سے قریب چودہ سو برس پیشتر حظیرۃ قدس کی ایک دلکش آواز اس کے کانوں میں آئی۔ کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ تمہارے دکھ کا درماں کیا ہے ... اس آواز نے بتایا کہ تمہاری بنیادی غلطی یہ ہے کہ تم نے سمجھ رکھا ہے کہ ایک انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے یہ غلط ہے اور شرفِ انسانیت کی تحقیر۔ یاد رکھو! اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ... (۱۲/۴۰) حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے جو تمام انسانوں سے بلند و بالا ہستی ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ایک وہی باقی بتانِ آذری

اس کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ تمام انسان ایک سطح پر ہیں اور برابر ہیں اس لئے کوئی کسی دوسرے پر بالادست نہیں ہو سکتا۔ بالادست صرف وہ ہستی ہو سکتی ہے، جو فی الواقعہ انسانوں سے بالاتر ہو۔ اور وہ صرف خدا کی ذات ہے۔

اسلام اور مذہبی رواداری

پروپیگنڈا اگر منظم طریقہ سے کیا جائے تو فی الواقعہ قلب ماہیت پیدا کر دیتا ہے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویئے بدل دیتا ہے۔ یہی وہ سحر سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں، کان اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کے آلۂ صوت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے دماغ سے ہیں۔ اسلام کے ساتھ بھی دنیا میں یہی کچھ ہوا۔ اقوام یورپ نے اسلام کے تصور کے جو ایڈیشن شائع کئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج دنیائے تہذیب و تمدن میں جہاں اسلام کا نام آتا ہے، قتل و غارت گری، بربادی و تباہی، ہلاکت و خون ریزی، جور و ظلم، ستم و استبداد کے خونی مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ طلوع اسلام جون ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں محترم پرویز صاحب کا ایک مقالہ بہ عنوان "اسلام اور مذہبی رواداری" شائع ہوا جس میں موصوف نے تاریخی شواہد سے ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام کی صورت کو مسخ کرنے والوں کی یہ بے باک جرأتیں فی الحقیقت ایک گھناؤنا پروپیگنڈا ہیں۔ دین اسلام جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے، امن و سلامتی، مساوات اور احترام انسانیت کا داعی ہے اور کسی حالت میں بھی رشتۂ عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔

کانگریس بے نقاب

طلوع اسلام کی شروع ہی سے یہ پکار تھی کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں کیلئے آزادی کی تحریک نہیں بلکہ یہ ایک خالص ہندو مذہبیت کی تحریک ہے اور مقصد اس سے مسلمانوں کی ملی خصوصیات کو مٹا کر ملک میں "رام راج" کا قیام ہے۔ قومیت پرست مسلمان اس کی تردید کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ تحریک خالص سیاسی تحریک ہے اس میں ہندوؤں کے پیش نظر کوئی ایسے عزائم نہیں۔ لیکن یہ راز کب تک مستور رہتا؟ اگست ۱۹۳۹ء میں کانگرس کے جنرل سیکریٹری اچاریہ کرپلانی کی طرف سے کانگریس کے عزائم و مقاصد سے متعلق ایک مبسوط بیان شائع ہوا جس میں اس نے کھلے کھلے الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ کانگریس کی تحریک اس فلسفۂ زندگی کی احیاء و ترویج کی تحریک ہے جسے مہاتما گاندھی پیش کر رہے ہیں۔ کانگریس کو محض سیاست کے دائرہ تک محدود سمجھنا غلطی ہے۔ اس کی تحریک ہر گوشۂ زندگی کو محیط ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں محترم پرویز صاحب نے اس بیان کا تجزیہ کرتے ہوئے قومیت پرست مسلمانوں سے پوچھا کہ:۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما!

کانگریس کی اس طرح نقاب کشائی سے بہت سی سعید روحیں اپنی غلط روی پر متنبہ ہو گئیں اور باقی وہی رہ گئے جن کے پیشِ نظر کچھ اپنے مقاصد تھے۔

مسلمان کی زندگی

اکتوبر ۱۹۳۹ء کے طلوعِ اسلام میں محترم پرویز صاحب کا مقالہ "مسلمان کی زندگی" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ قرآنِ کریم کے مطابق ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض یعنی اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے استبداد و ملوکیت کی لعنت نہیں جس میں آج مسلمان گرفتار ہیں۔

یاد رکھئے! جس ایمان و عملِ صالح کا جیتا جاگتا، زندہ و پائندہ نتیجہ اس دنیا میں اسلامی نظام کا قیام نہیں یعنی جماعتِ مومنین کا استخلاف فی الارض نہیں، ضابطۂ الٰہی کے مطابق جہاں بانی و جہاں رانی نہیں، وہ ایمان قرآنی ایمان نہیں وہ اعمال اسلامی اعمال نہیں، انہیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے، نگاہ کا پھیر ہے۔ مسلمان کے لیے اعمالِ صالح کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے باقی سب فریبِ نفس ہے، ابلیس کے دھوکے ہیں۔

[illegible] حکومت

[illegible] کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت، کانگریس نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں حکومت [illegible] اور ڈھائی سال تک مسلمان اقلیت پر جس جس انداز سے مظالم توڑے ان کی یاد آج بھی ہر صاحبِ حس کو مجسم پیچ و تاب بنا دیتی ہے۔ خدا خدا کر کے اس دورِ استبداد کا خاتمہ ہوا۔ جب کانگریسی وزراء نے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیئے۔ اس بلائے عظیم سے رستگاری پر، مسلم لیگ نے "یومِ نجات" منایا اور اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے ایک جامع پمفلٹ میں بتایا کہ مسلمانوں کے یہ سجدہ ہائے تشکر و امتنان اس لیے ہیں کہ مسلمان دنیا میں نہ انگریز کا غلام رہ کر جی سکتا ہے، نہ ہندو کا۔ یہ صرف اپنے اللہ کا مطیع اور اس کے آئین کا فرماں بردار رہ کر ہی بحیثیت مسلمان زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اسی پرچہ میں محترم پرویز صاحب کا ایک اور مبسوط مضمون بعنوان "نیشلسٹ علماء" کی پہلی قسط بھی شائع ہوئی۔ جو ان حضرات کے سامنے ان کی صحیح تصویر پیش کرنے کی ایک جاذب کوشش تھی۔

سپاس نامہ بحضور قائداعظمؒ

مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ۱۹۳۸ء سے ہوا۔ دو سال کے عرصہ میں ملّتِ اسلامیہ کے اس اہم "مقدمہ" کے وکیل نے اس کے اصول و مبادیات کی تشریح و توضیح میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلم لیگ اس قوم کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ یہ تھے وہ بنیادی اصول جو اس دو سال کے عرصہ میں بدلائلِ منیرہ و براہینِ قاطعہ دنیا کی عدالت میں بار بار پیش کئے گئے۔ اب وقت آ چکا تھا کہ اس قوم کے اصل دعوے کو واضح الفاظ میں سامنے لایا جائے۔ اس مقصد کے لیے مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور مسلم لیگ کا وہ معرکۃ آلارا اجلاس منعقد ہوا جس نے نہ صرف ملّتِ اسلامیہ کی تقدیر بدل دی بلکہ دنیا کے نقشے میں ایک اہم تبدیلی پیدا کر دی۔ اس تقریب پر ملّتِ اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا قائداعظم محمد علی جناح کی خدمت میں

ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جو درحقیقت پوری قوم کی طرف سے سپاسنامہ تھا۔ اور جو ادبی لحاظ سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی سپاسنامہ کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔

بشرفِ نظر

شیرِ بیشۂ بے باکی و حریت۔ ضیغمِ نیستانِ جرأت و بسالت۔ شاہینِ افلاکِ تدبر و سیاست، پروانۂ شمعِ اخوت و حمیت۔ طرۂ کلاہِ ملک و ملت۔ بطلِ جلیلِ ہندیاں و قائدِ اعظم اسلامیانِ عزت مآب

محترم المقام جناب محمد علی جناح مدظلہ العالی

حریت نواز! ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے تحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا، سر پر منڈلاتی ہوئی شبِ تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا، برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو، ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں کہ دورِ افق کے اس پار سے ایک شاہسوارِ رواں دواں، امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لیے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہند) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی رَو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لیے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کر کے آ رہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گئو سالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لیے

قوم کی صحیح رہنمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں

طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جو درحقیقت پوری قوم کی طرف سے سپاسنامہ تھا۔ اور جو ادبی لحاظ سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی سپاسنامہ کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے:۔

بشرفِ نظر

شیرِ بیشۂ بے باکی و حریت۔ ضیغم نیستانِ جرأت و بسالت۔ شاہینِ افلاکِ تدبر و سیاست، پروانۂ شمعِ اخوت و محبت۔ طرۂ کلاہِ ملک و ملت۔ بطلِ جلیلِ ہندیاں و قائدِ اعظم اسلامیاں، عزت مآب

محترم المقام جناب محمد علی جناح مدظلہ العالی

حریت نواز! ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک گھبرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے تحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا۔ سر پر منڈلاتی ہوئی شبِ تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا، برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دشمنوں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو، ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں کہ دورِ افق کے اس پار سے ایک شاہسوارِ رواں دواں، امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لیے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت اس راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہند) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں اِدھر سے اُدھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی رَو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لیے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کر کے آ رہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گئو سالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لیے

قوم کی صحیح رہنمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں

غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ بھی کچھ کم سنگ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جاں گداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہ وار دہا 'RADIO STATION' کے آلۂ مکبّر الصوت 'LOUD SPEAKER' بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں لیکن سب سے زیادہ ماتم تو اُن "مخلص منافقین" کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بیش ازیں نیست کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو

جن کا مقصدِ وحید اپنے طرّۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجۂ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکرِ بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجوم مخالفت ایسا ہے کہ اس سے خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے کہ جو حق پر ہو اُسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا

حریت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تگ و دوِ حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے جس کے دل میں بحیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بحیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے۔ اور کیسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند 'MUSLIM INDIA' کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال و ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں، وہ آپ کی بلند نگہی اور حسن تدبّر کا آئینہ دار ہے۔ سطح بین لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنّن اور دیدہ ور مدبّر کی حیثیت سے ہی پہچانا لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مبداءِ فیض نے آپ کو اس قدر ذہنِ رسا کے ساتھ کس قدر دلِ پُرسوز و پُردرد کی نعمتوں سے نوازا ہے:

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے تجھ کو حدیثِ رندانہ

اور قلب و نظر اور عقل و عشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتئ ملّت کی متاعِ گراں بہا ہے:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

عالی مرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہیٰ ہے، اس قوم کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے اور ان کی خاطر آپ نے جو گراں قدر قربانیاں کی ہیں، اُن کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمینِ پنجاب جو ملتِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے اس میں آئینی نکتۂ نگاہ سے 'CONSTITUTIONALLY' ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا۔ لیکن ہمیں اُمید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہُوا ہے۔ بس کسی ایک مردِ خود آگاہ و خدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے یہ طوفانِ بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رُکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہوگا اور پکارنے والا پکارے گا کہ:

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ

سیّد القوم!

ادارۂ طلوعِ اسلام جسے ہزارہا پُر خلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے، اجلاسِ لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے اور مُستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اُٹھ رہا ہے، قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جایئے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بر دوش، سر بکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے:

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

اراکین ادارۂ طلوعِ اسلام - دہلی

مارچ ۱۹۴۰ء میں اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر رام گڑھ کے مقام پر کانگریس کے سالانہ اجلاس کی کرسیٔ صدارت سے راشٹرپتی ابوالکلام صاحب آزاد، اعلان فرما رہے تھے کہ مسلمانوں کا دعویٰ 'آزادی غلط ہے۔ انہیں ہندوؤں کا غلام بن کر جینا ہوگا کہ یہی اسلام کی تعلیم ہے، یہی قرآن کا ارشاد ہے۔ ادھر یہ دونوں اجتماعات لاہور اور رام گڑھ میں انعقاد پذیر تھے اور ادھر جبریل اور ابلیس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہو رہے تھے۔ زمین اس بدبختی پر روتی تھی اور تقدیر اس پر ہنستی تھی۔ اپریل ۱۹۴۰ء کے طلوعِ اسلام میں جناب آزاد کے خطبۂ صدارت پر محترم پرویز صاحب کا ایک جامع تبصرہ شائع ہوا جس میں انہیں بتایا گیا کہ ان کا آج کا قرآن، ان کے تیس برس پیشتر کے قرآن سے کس قدر مختلف تھا!

جہانِ نو

جب ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعِ لاہور نے اپنے مطالبہ کو واضح طور پر متعین کر کے اس کا اعلان کر دیا تو ضرورت اس امر کی تھی کہ اس مطالبہ کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل بحث کی جائے اور اس کے ماعلیہ و مالہٗ پر بالوضاحت تنقید و تبصرہ سے اپنوں اور بیگانوں کو بتایا جائے کہ یہ مطالبہ کیا ہے؟ کس لیئے کیا گیا ہے؟ اور اس کے حصول کا طریق کیا ہوگا۔ اس کے لیئے جون ۱۹۴۰ء کے طلوعِ اسلام میں محترم پرویز صاحب کا اسّی صفحات پر مشتمل ایک جامع مضمون بعنوان "جہانِ نو" شائع ہوا۔ جس نے فی الواقع دنیا کو ایک "جہانِ نو" سے متعارف کرایا۔ اس مضمون کی کثیر اشاعت سے مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمان اس مطالبہ پر کیوں مجبور ہے۔ اس سے حقیقی مقصد کیا ہے اور یہ کہ اس جہانِ نو کے قیام سے کس طرح اس دنیائے کہن کا جہنم تسکین و طمانیت کی جنت میں تبدیل ہو جائے گا۔

ختمِ نبوت

اگست ۱۹۴۰ء میں محترم پرویز صاحب کا ایک اور مضمون "ختمِ نبوت" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں "ایک آنے والے" کے مجوسی عقیدہ کی حقیقت کو بے نقاب کیا گیا اور بتایا گیا کہ قرآنِ کریم میں نہ کسی مجدد کا ذکر ہے نہ مہدی کا۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ بذاتِ خود تشریف لانے کا۔ "مسیحِ موعود" کی اصطلاح بھی غیر قرآنی ہے۔ اس میں کسی مسیح کے آنے کا وعدہ نہیں کیا گیا یہ تمام نظریات ہمارے یہاں روایات کے ذریعے جزوِ اسلام بن گئے۔ یہ تصورات بنیادی طور پر ختمِ نبوت کے نقیض ہیں جن کی اساس پر دعوائے نبوت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر مشہور تاریخی مقدمہ بہاولپور کی یاد ایک مرتبہ پھر تازہ کر لی جائے تاکہ نوجوان نسل اور لاعلم حضرات اس حقیقت سے واقف ہو جائیں کہ "قادیانی" حضرات کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کا جو کاغذی سہرا علماء کرام اپنے سر باندھتے ہیں وہ کس حد تک درست ہے۔

مقدمہ بہاولپور

۱۹۲۶ء کا ذکر ہے، ریاست بہاول پور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے خاوند نے قادیانی مسلک اختیار کر لیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتد ہو گیا ہے اس لیئے اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں فریقین کی حیثیت بڑی ممتاز تھی، وہ تو بالکل غیر معروف سے تھے۔ یہ اس لیے کہ ہندوستان میں (غالباً) یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا، جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک شخص قادیانی مسلک اختیار کرنے کے بعد مسلمان رہتا ہے یا نہیں۔ اس اعتبار سے یہ مقدمہ متعلقہ فریقین کا مابہ النزاع معاملہ نہ رہا بلکہ قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے مابین ایک دینی سوال بن گیا جس کا عدالتی فیصلہ (ظاہر ہے) کہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ مقدمہ قریب ۹ سال

تک زیرِ سماعت رہا اور بالآخر محمد اکبر صاحب ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے (جواب مرحوم ہو چکے ہیں) ۷ر فروری ۱۹۳۵ء کو اس مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ اپنی شہرت اور اہمیت کے پیشِ نظر اس زمانے میں الگ چھپ گیا تھا اور اس کے بعد متعدد بار شائع ہوتا رہا، جون ۱۹۷۳ء تک محفلِ ارشادیہ سیالکوٹ کی طرف سے پھر ایک مرتبہ منظرِ عام پر آیا۔ اس فیصلہ کے صفحہ نمبر ۳۵ پر بتایا گیا ہے کہ مدعیہ کی طرف سے بڑے بڑے جید علماء کرام بطور گواہ پیش ہوئے، مثلاً مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور، مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور، مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری اور مولانا سید انور شاہ صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند وغیرہ۔ اس سے اس مسئلہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ اس مسئلہ کا سارا دارومدار اس بات پر تھا کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے اور نبی کہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ:-

"موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمان نبی کی حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں۔ اس لیے بھی ان کے دلوں میں یہ مسئلہ گھر نہیں کر سکتا کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے میں کیا قباحت ہوتی ہے کہ جس پر اس قدر چیخ و پکار کی جا رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی کچھ تھوڑی سی حقیقت بیان کر دی جائے۔ مدعیہ کی طرف سے نبی کی کوئی تعریف بیان نہیں کی گئی صرف یہ کہا گیا ہے کہ نبوت ایک عہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا جاتا رہا ہے۔ اور نبی اور رسول میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ہر رسول، نبی ہوتا ہے اور نبی کے لیے لازمی نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ فریق ثانی نے (بحوالہ نبراس ص۳) بیان کیا ہے کہ رسول ایک انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ احکام شریعت کی تبلیغ کے لیے بھیجتا ہے۔ بخلاف نبی کے کہ وہ عام ہے کتاب لائے یا نہ لائے، رسول کے لیے کتاب لانا شرط ہے۔ اسی طرح رسول کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جو صاحبِ کتاب ہو یا سابقہ شریعت کے بعض احکام کو منسوخ کر دے۔"

(فیصلہ ص ۱۰۶)

اس کے بعد فاضل جج نے لکھا:-

"یہ تعریفیں چونکہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ناکافی تھیں اس لیے میں اس جستجو میں رہا کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی تعریف مل جائے جو تصریحاتِ قرآن کی رُو سے تمام لوازمِ نبوت پر حاوی ہو۔"

(فیصلہ ص ۱۰۷)

اس کے بعد فاضل جج نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس باب میں کافی جستجو کی لیکن نبی کی کوئی جامع تعریف

انہیں نہ مل سکی۔ آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان "میکانکی اسلام" از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز، میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آج کل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے میری رائے میں، اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔"

(فیصلہ ص۱۰۱)

ازاں بعد فاضل جج نے محترم پرویز صاحب کے مذکورہ مضمون سے خاصا مفصل اقتباس درج کیا اور نبی کی جو تعریف محترم پرویز صاحب نے پیش کی تھی اس پر مبنی بحث کے بعد اپنے فیصلہ میں کہا کہ:۔

"مدعا علیہ، قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخ ارتدادِ مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے۔"

(فیصلہ ص۱۸۴)

مذکورہ بالا فیصلہ میں فاضل جج نے لکھا ہے کہ ان کی عدالت میں (غیر منقسم) ہندوستان کے بڑے بڑے جید علماء حضرات پیش ہوئے جن میں سے ایک ایک کا بیان سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھا لیکن یہ حقیقت نبوت کے متعلق ان میں سے کسی کے بیان سے بھی مطمئن نہ ہو سکے وہ مطمئن ہوئے تو محترم پرویز صاحب کے مضمون سے جو اس مقدمہ سے بالکل الگ آزادانہ لکھا گیا تھا اور یہ صدقہ تھا محترم پرویز صاحب کی قرآن فہمی کا جو تاریخ کے صفحات پر نقش ہو کر رہ گیا۔

محترم پرویز صاحب کا یہ تاریخی کارنامہ تو بر سبیل تذکرہ سامنے آگیا، بات جاری تھی محترم پرویز صاحب کے اس کردار کی جو تحریک پاکستان کے سلسلہ میں انہوں نے انجام دیں۔

اسلام اور سائنس

عجمی تصوف کے ترکِ دنیا کے فلسفہ نے جب مسلمانوں کی زندہ اور زندگی بخش دنیا کو قبرستان میں تبدیل کر دیا۔ تو نہ ان کے ذہنوں میں ندرتِ افکار رہی نہ بازوؤں میں قوتِ تخلیق، دماغ تقلیدِ جامد کی برفانی سلوں سے مفلوج ہو گئے اور وہ آہنی پنجے جو پتھروں کے سینہ میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو کھینچ کر اپنے قبضۂ قدرت میں لے آیا کرتے تھے کند ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو گئی کہ دنیا اور اس سے متعلق تمام علوم و فنون کفار کا حصہ قرار پا گئے اور محکومی و محتاجی کی ذلیل زندگی کو "اللہ کی رحمت" قرار دے کر مسلمانوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ آخرت کی تمام سرفرازیاں ہمارا ہی حصہ ہیں۔ اس

بجھی افسوں کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے سامنے اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ قرآن نے علومِ طبیعی پر غور و فکر کرنے اور اشیائے کائنات سے نفع اندوز ہونے کی کس قدر تاکید کی ہے اور جب قرآن کی صحیح تعلیم مسلمانوں کے سامنے تھی تو اس باب میں انہوں نے کس قدر تجسس و کاوش سے کام لیا تھا اس موضوع پر محترم پرویزؒ صاحب کا تحقیقاتی مقالہ "اسلام اور سائنس" مارچ ۱۹۴۱ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہوا۔

فردوسِ گم گشتہ اپریل ۱۹۴۱ء میں محترم پرویزؒ صاحب کا ایک اور مضمون بعنوان "فردوسِ گم گشتہ" شائع ہوا جس میں انہوں نے بتایا کہ وہ جنّتِ ارضی جس کے ہم کبھی وارث تھے، کس طرح ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور اب اس کی باریابی کی کیا صورت ہے۔

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں ہندوؤں کو مسلمانوں سے کسی اور باب میں تو خطرہ نہ تھا، اور جو خطرات تھے بھی، ان کے مقابلہ کی تیاریاں وہ ساتھ کے ساتھ کئے جا رہے تھے۔ لیکن ایک میدان ایسا تھا جسے وہ انتہائی خطرناک سمجھتے تھے اور جس کے مقابلہ کا خاطر خواہ سامان ان کے پاس موجود نہ تھا۔ یہ میدان تھا مذہب کا۔ ہندوؤں کو خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کر دی تو ہندو مت اس کے مقابلہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکے گا۔ یہ خطرہ ان کے لیے ہر وقت سوہانِ رُوح تھا۔ اس کی روک تھام کیلئے گاندھی جی نے اس فلسفہ کا پرچار شروع کیا کہ دنیا میں تمام مذاہب یکساں ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ مطلب واضح تھا کہ اگر ہندو مت اتنا بلند نہیں ہو سکتا کہ اسلام کی سطح تک پہنچ جائے تو اسلام کو اس کے مقام سے نیچے اتار کر ہندو مت کی سطح پر رکھ دیا جائے۔ لیکن گاندھی جی اس حربہ کے کمزور پہلو سے بھی خوب واقف تھے وہ جانتے تھے کہ ان کے کہنے سے مسلمانوں پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو گا کہ اسلام اور ہندو مت ایک جیسے مذہب ہیں۔ اس کی کو مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی برجستہ سماجی تفسیر (ترجمان القرآن) نے پورا کر دیا جس میں مختلف انداز سے اس چیز کو اُبھارا گیا کہ "عالمگیر صداقتیں" تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ یہ خطرہ بہت دُور رس تھا اس لیے کہ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالمِ قرآن کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے اور ان کے الفاظ کا جادو مسلّم تھا۔ اس سحرِ سامری کی شکست و ریخت کے لیے محترم پرویزؒ کا ایک مدلّل اور مسکت مضمون "کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟" اگست ۱۹۴۱ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہوا جس نے اس طلسم کے عنکبوت کو قرآنی دلائل و شواہد سے بے نقاب کر کے رکھ دیا اور مسلمان گاندھی جی کی اس سازش کا شکار ہونے سے بچ گئے۔

دنیا کی نجات اکتوبر ۱۹۴۱ء میں محترم پرویزؒ صاحب کا ایک اہم مضمون "نجات کا قرآنی نظریہ" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ قرآن کریم کی رُو سے زندگی کا مقصود کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا (نجات) نہیں بلکہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما سے بلند مقامات کا حصول ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے

واضح الفاظ میں کہہ دیا کر یاد رکھو! قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۔ جس نے تخمِ حیات کو نشوونما دیا اُس کی کھیتی بار آور ہوئی۔ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۔ جس نے اس بیج کو مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا اس کی کھیتی کا ثمر بار ہونا تو ایک طرف، خود بیج بھی ضائع ہو گیا۔

نظریۂ ارتقاء اور قرآنِ کریم دسمبر ۱۹۴۱ء میں محترم پرویزؔ صاحب کا ایک اور تحقیقی مضمون منظرِ عام پر آیا جس میں نظریۂ ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف نے لکھا: "قرآن کریم کا اندازیہ ہے کہ وہ قانونِ ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دلنشیں کراتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کارگۂ سعی و عمل میں وہی نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو۔ وہی نوع باقی رہ سکتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کرے۔ قرآن کریم دیگر انواع کی مثال دے کر اس سے خود انسانی زندگی پر استشہاد کرتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم الشان درخت کو دیکھو اور غور کرو کہ کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں، کتنے پھول تھے جو مرجھا گئے اور راستہ چلنے والوں کے پاؤں تلے آکر مسلے گئے۔ اس کے برعکس کتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں۔ کیسے کیسے شگفتہ اور نورستہ پھول لائیں اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھل پیدا کئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر غور کرو اور سوچو کہ اقوام و مللِ گزشتہ کا کیا حشر ہوا۔ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے۔ جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی فنا ہو جاتی ہے۔

اپنی آنکھ اور قرآنِ کریم اپریل ۱۹۴۲ء میں ان کا ایک اور مضمون بعنوان "اپنی آنکھ اور قرآن کریم" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ قرآن کریم کے شمعِ نورانی پر غیر اسلامی تصورات کے رنگین فانوس کس کس انداز سے چڑھائے گئے اور عجمی سازش نے کس طرح "دینِ اسلام" کو "مذہب" میں تبدیل کر دیا۔

اس مختصر سے تعارف سے اندازہ ہوتا ہے کہ برِصغیر کی ہنگامی سیاست پر تنقید و تبصرہ کے ساتھ ساتھ محترم پرویزؔ صاحب نے مسلمانوں کے قلب و نگاہ کی صحیح تعمیر کے لیے کیا کچھ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے مذکورہ بالا مضامین میں سے ایک ایک مضمون، اپنی جگہ ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

معارف القرآن محترم پرویزؔ صاحب کے مضامین جن کا ذکر اوپر آچکا ہے درحقیقت ان کے تدبر فی القرآن کے منتشر اجزاء تھے۔ ان کے اس تدبر کی مستقل صورت وہ عظیم القدر سلسلۂ تصانیف ہیں جو "معارف القرآن" کے نام سے وجہِ فروغِ البصار ہوئیں۔ اس سلسلہ کی پہلی جلد کی اشاعت کا فخر طلوعِ اسلام کو حاصل ہوا جو ۱۹۴۱ء میں منظرِ عام پر مشہود ہوا۔ اس کے بعد اس مبسوط اور اہم تصنیف کی دو جلدیں اور شائع ہوئیں اور باقی جلدیں تشکیلِ پاکستان کے بعد ضبطِ تحریر میں آئیں۔

قائدِ اعظم اور قرآن کریم

اس مقام پر اس حقیقت کا اظہار غیر محل نہ ہو گا کہ جہاں تک "قرآن فہمی" کے شعبہ کا تعلق ہے، محترم پرویز صاحب کو قائداعظم محمد علی جناحؒ کا اتالیق ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جیسا کہ اُوپر کی سطور میں بتایا گیا ہے کہ محترم پرویز صاحب حکومت ہند کے مرکزی سیکرٹریٹ میں ملازم تھے۔ اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے بعد اکثر اوقات وہ قائدِ اعظمؒ کی کوٹھی چلے جاتے تھے جہاں وہ مختلف موضوعات پر قائدِ اعظمؒ کو قرآن کریم کا درس دیتے تھے۔ قائداعظمؒ کو قرآن فہمی کا کس درجہ شوق تھا اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ پروٹوکول کا پابند ہونے اور بے پناہ مصروفیات کے باوجود، محترم پرویز صاحب کو قائدِ اعظمؒ نے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ بلا روک ٹوک ان سے کسی بھی وقت ملاقات کے لیے آ سکتے ہیں۔ قرآن فہمی کی یہ محفل بعض اوقات گھنٹوں جاری رہتی۔ محترم پرویز صاحب کہتے تھے کہ ایک مقنن کی حیثیت سے ان کی فہم و فراست کا یہ عالم تھا کہ وہ اکثر اوقات چند جملوں ہی میں زیرِ نظر موضوع کا بآسانی احاطہ کر لیتے تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے پرویزؔ سے جس حد تک قرآن کو سمجھا اس کا اظہار ان کی تقاریر خطابات اور پریس کانفرنسوں سے عیاں ہے۔ ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن میں خطاب فرماتے ہوئے قائداعظمؒ نے اس امر کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا:-

"میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرض یہ کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔ "اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔"

قائداعظمؒ سے ملاقاتوں کا تذکرہ محترم پرویز صاحب احباب کی محافل میں اکثر کیا کرتے تھے۔ ایک ایسی ہی محفل میں پرویزؒ صاحب نے اس واقعہ کا ذکر کیا جسکا بعد میں انہوں نے اپنے ۱۲ ستمبر ۱۹۷۲ء کے خطاب "عظمتِ کردار کا گوہرِ تابدار" میں اسطرح اظہار فرمایا:-

"اور آخر میں ایک ایسا واقعہ جس کی یاد مجھے زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ اکثر لوگوں کو اس پر تعجب ہوتا کہ میری اور قائدِ اعظمؒ کی پوزیشن میں اس قدر بُعد کے باوجود، وہ کون سی بات تھی

جس کی وجہ سے مجھے ان سے اس قدر قرب حاصل تھا۔ میرے اس زمانے کے قریبی احباب تو اس راز سے واقف تھے لیکن میں نے اس کا ذکر بہت کم کیا ہے۔ میرے اس قرب کی وجہ بھی ان کا قرآنی ذوق۔ مجھے اس کی اجازت تھی کہ میں پہلے وقت لئے بغیر ان کی خدمت کے اوقات میں حاضرِ خدمت ہو جایا کروں۔ میں جب بھی حاضر ہوتا پیش آمدہ اہم معاملہ کے بعد، قرآن کریم کے کسی نہ کسی اہم مقام پر بات شروع ہو جاتی۔ میں نے ان جیسا ذکی الفہم انسان بہت کم دیکھا ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ "خارے دید و احوال چمن گفت"۔ ذرا سے نکتہ سے پوری بات فوراً سمجھ لیتے تھے۔ یہ غالباً مارچ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے کہ ایک نشست میں، میں نے قرآن مجید کے کسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ حضور نبی اکرمؐ کی ساری عمر (شریف) اپنے مقصد کے حصول میں جانکاہ مشقتیں اٹھاتے گزر گئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کسی وقت حضورؐ کے قلبِ مطہر میں یہ حسین و معصوم سی آرزو ابھری کہ بارِ الٰہا! میں اپنے مقصد کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاصل ہوتے دیکھ سکوں گا یا میری زندگی اس تگ و تاز میں گزر جائے گی؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا کہ: وَاِنْ نُّرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) جو کچھ تمہارے پروگرام کے مخالفین سے کہا جا رہا ہے وہ تیری زندگی میں تیرے سامنے آ جائے یا اس سے پہلے ہی تیری وفات ہو جائے۔ اس سے تجھے کچھ سروکار نہیں۔ تیرا کام اس پیغام کو عام کرتے جانا ہے، یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آتا ہے۔ میں رواداری میں یہ سب کچھ کہہ تو گیا لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ (ان کی آنکھوں میں آنسو بہت کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے)۔ یہ دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پر یہ کیفیت کیوں طاری ہو گئی۔ فرمایا کہ میں نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستی کے لئے بھی ذرا سی رعایت روا نہیں رکھی اور صاف کہہ دیا کہ یہ قانون کے مطابق واقع ہو گا۔ خواہ تمہاری زندگی میں ہو اور خواہ اس کے بعد۔ تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ وہ ہماری خاطر اپنے قانون میں کیوں رعایت برتنے لگا۔ اس لئے معلوم نہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھ سکیں گے یا نہیں؟ اس پر مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے نادانستہ کیا غلطی ہو گئی۔ میرے مضراب نے ان کے تارِ رگِ جان کو چھیڑ دیا؟ میں نے اس احساس کی شدت

کو کم کرنے کے لئے کہا کہ نہیں! حضورؐ کے مقصد کا حصول حضورؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو گیا تھا۔ فرمایا کہ یہ الگ بات ہے۔ لیکن خدا نے اپنے قانون میں تو کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ یہ کہکر وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اس وقت تو مجھے اسکا علم و احساس نہیں تھا۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اس گہری سوچ میں ان کے پیش نظر (شاید) اپنے پارسی ڈاکٹر کے سیف میں محفوظ رکھا ہوا وہ ایکس رے ہوگا جس کا تذکرہ اب ماؤنٹ بیٹن نے کیا ہے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ عزیزم! جو کچھ میں نے کہا ہے۔ اس سے کوئی غلط مفہوم نہ لے لینا۔ قانونِ خداوندی کے بے لچک ہونے کے ساتھ، ہمیں اپنے سامنے اُسوۂ رسولؐ رکھنا چاہیئے۔ حضورؐ نے اس جواب کے ملنے کے بعد، اپنی تگ و تاز میں کسی قسم کی کمی نہیں کر دی تھی۔ ہمیں بھی اپنی جدوجہد بدستور رکھنی چاہیئے اور نتیجہ کا انتظار خدا کے قانون کے مطابق کرنا چاہیئے۔

جرأت مندانہ اقدام۔ پارلیمنٹ اور سینٹ میں قرآن کی آواز

پرویز صاحب نے قائداعظمؒ کی برسی اور سالگرہ کی تقاریب پر جو خطاب پیش فرمایا اور جو بعد میں "عظمتِ کردار کا گوہرِ تابندہ" کے عنوان سے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہوا، اس نے ملک میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور ہر بڑی محفل میں اس کا چرچا رہا۔ مقامِ مسرت ہے کہ اس گوہرِ تابندہ کی شعاعوں نے پاکستان کی مجلسِ قانون ساز کے ایوان کو بھی جلا بخشی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو قائداعظمؒ کے صد سالہ جشنِ ولادت کے سلسلہ میں منعقدہ وفاقی پارلیمان اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس میں محترم کوثر نیازی صاحب نے بھی خطاب فرمایا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کہا اسے ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

"مفتی صاحب! مولانا صاحب! لباسوں میں کیا رکھا ہے؟ جو کچھ ہے عمل ہے۔ آیئے ترکِ رسوم کے موحد کا ایک واقعہ سنیئے۔ جناحؒ مذہبی تاجر نہ تھا۔ مذہب کا مفکر نہ تھا۔ اور دنیاوی امور میں پروٹوکول کا شدت سے خیال رکھنے والا، جس کو اپوائنٹ منٹ کے بغیر ملنے کا کوئی تصور تک نہیں کر سکتا تھا، اس کی جلوت و خلوت میں، اس شخص کو ہر وقت، ہر لمحے تمام فارمیلیٹیز 'FORMALITIES' کے بغیر حاضر ہونے کی اجازت تھی۔ جو انہیں کلام اللہ پر فکر کرنے کے لئے آیات سنایا کرتا تھا۔ وہ خود مروی ہے کہ ایک نشست

میں، میں نے قرآن مجید کے کسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ حضور نبی کریمؐ کی ساری عمر مبارک اپنے مقصد کے حصول میں جانکاہ مشقتیں اٹھاتے گزر گئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کسی وقت حضورؐ کے قلبِ مطہر میں حسین و معصوم سی آرزو ابھری کہ بار الہا! میں اپنے مقصد کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاصل ہوتے دیکھ سکوں گا یا میری زندگی اسی تگ و تاز میں گزر جائیگی۔

اللہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا کہ :-

جو کچھ تمہارے پروگرام کے مخالفین سے کہا جا رہا ہے وہ تیری زندگی میں تیرے سامنے آجائے یا اس سے پہلے ہی تیری وفات ہو جائے اس سے تجھ کو سروکار نہیں۔ تیرا کام اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آتا ہے۔

اس شخص نے لکھا ہے کہ یہ سن کر قائد اعظمؒ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے۔ شاید ہی کسی نے قائد اعظمؒ کو آبدیدہ دیکھا ہوگا۔ کیوں؟ قائدؒ ہی کے الفاظ میں سنیئے۔ فرمایا :-

جب اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستی کے لئے بھی ذرا سی رعایت روا نہیں رکھی اور صاف کہدیا کہ یہ ہمارے قانون کے مطابق ہوگا خواہ تمہاری زندگی میں ہو خواہ اس کے بعد۔ تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ وہ ہماری خاطر اپنے قانون میں کیوں رعایت برتے گا؟ اس لئے معلوم نہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھ سکیں گے یا نہیں؟

یہ کسی صوفی یا مولوی کا ردِّ عمل نہیں، محمد علی جناحؒ کا ردِّ عمل ہے۔ آپ نے بہت سی تفسیریں پڑھی ہوں گی لیکن اس آیت پر جناحؒ جیسے عملی آدمی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ نے بات بنا دی۔ ورنہ خدا کا جواب تو بڑا خشک اور قانونی تھا۔"

(نوائے وقت ۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء)

قارئینِ طلوعِ اسلام جانتے ہیں کہ یہ واقعہ، مذکورہ پمفلٹ سے مقتبس ہے اور اس کے راوی خود پرویزؒ صاحب ہیں اور یہ امر خوش آئند اور موجبِ صد مسرت ہے کہ قرآن کریم کی آواز ایوانِ حکومت تک بھی جا پہنچی۔ للہ الحمد۔

قائد اعظمؒ اور محترم پرویزؒ صاحب

قارئینِ طلوعِ اسلام کے لئے اس مقام پر اس امر کا انکشاف کرنا بے محل نہ ہوگا کہ قائد اعظمؒ محترم پرویزؒ صاحب

سے صرف قرآن مجید کی تعلیم ہی حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ وہ تحریک پاکستان اور مملکت کے امور میں بھی پرویزؒ صاحب سے مشورے کیا کرتے تھے۔ قائداعظمؒ محترم پرویزؒ صاحب پر کس قدر اعتماد اور بھروسہ رکھتے تھے اس حقیقت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ مستقبل کے پاکستان کی سیکریٹریٹ میں مناسب اشخاص کی تقرری کے لئے قائداعظمؒ نے محترم پرویزؒ صاحب کو خط لکھا جس کا عکس شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

10 AURANGZEB ROAD
NEW DELHI

14th June, 1947.

Dear Mr. Parvez,

I thank you for your letter of of 13th June. Will you please send me the names of those who, you think, will be the real servants of our future Secretariat?

Yours sincerely,

M. A. Jinnah

G. A. Parvez, Esq.,
37, Turkman Road,
NEW DELHI.

قائداعظمؒ محمد علی جناحؒ اور محترم غلام احمد پرویزؒ صاحب کی باہمی رفاقت کے دیگر واقعات و شواہد کسی مناسب موقع پر منظرِ عام پر لائے جائیں گے جنہیں یکجا اور مربوط کرنے کا فریضہ طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور انجام دے رہا ہے۔

جون ۱۹۴۲ء کے بعد

گزشتہ اوراق میں ان احوال و کوائف کا اجمالی سا تذکرہ آپ کے سامنے آچکا ہے جو ۱۹۳۸ء سے جون ۱۹۴۲ء تک مسلمانانِ ہندوستان کی بساطِ سیاست پر رونما ہوئے اور ان کے ساتھ ہی ان مساعی کا مختصر سا تعارف بھی ہو گیا جو اس باب میں محترم پرویزؒ صاحب اور طلوعِ اسلام کی طرف سے وجود کو شش ہوئیں۔ اس مختصر سے تعارف سے آپ نے یہ اندازہ بھی لگا لیا ہو گا کہ ہنگامی سیاست پر تنقید و تبصرہ کے ساتھ ساتھ محترم پرویزؒ صاحب نے ملتِ اسلامیہ کے قلب و نگاہ کی صحیح تعمیر کے لئے کیا کچھ کیا؟

جون ۱۹۴۲ء میں طلوع اسلام کی اشاعت کا سلسلہ ناگزیر حالات کی بنا پر ملتوی ہو گیا۔ اس کے بعد سے اگست ۱۹۴۷ء تک ہندوستان میں جو اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے انہیں سے چند اہم واقعات یہ ہیں۔ کرپس تجاویز: ہندو راج مسلط کرنے کی آخری کوشش۔ مسلمانانِ بنگال کے مصائب۔ روزنامہ ڈان کا اجراء۔ کانگرس اور مسلم لیگ میں کش مکش۔ بمبئی میں قائداعظمؒ پر قاتلانہ حملہ۔ خضر حیات کی مسلم لیگ سے بغاوت۔ مسلمانانِ پنجاب میں زندگی کی لہر۔ مسلم لیگ اور کانگرس میں مفاہمت کی ناکام کوشش۔ قائداعظمؒ اور گاندھی جی کی بمبئی میں ملاقات۔ جناحؒ گاندھی خط و کتابت۔ پہلی شملہ کانفرنس۔ ہندوستان میں انتخابات کا اعلان۔ مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کی فتح۔ منافقین کے کارنامے۔ وزارتی مشن۔ مذاکرات دہلی اور شملہ کانفرنس۔ جماعتِ اسلامی کی قائداعظمؒ کے خلاف محاذ آرائی۔ برطانوی حکومت کی عہد شکنی۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس۔ خطابات (TITLES AND AWARDS) کی واپسی۔ یوم سیاہ۔ عارضی حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت۔ المیۂ بہار۔ سندھ کی فتح مبین۔ لندن کانفرنس۔ فسادات پنجاب۔ ریڈکلف مشن مسلمانوں کا قتل عام۔ تقسیم ہند کا اعلان وغیرہ۔ ان میں سے ہر عنوان تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ مختصر طور پر ان کی تفاصیل بیان بھی کی جائیں تو اس کے لئے کم و بیش مزید پچاس صفحات درکار ہوں گے جسکا طلوع اسلام متحمل نہیں ہو سکتا۔ جو قارئین تسلسل قائم رکھنے کے متمنی ہوں ان سے درخواست ہے کہ وہ ماہنامہ طلوع اسلام ۱۹۴۹ء کا مطالعہ کر لیں۔ اگر قارئین کے لئے یہ امر دشوار کن ہو تو وہ ادارہ کو تحریر فرمائیں تاکہ کسی مناسب وقت پر یہ تفاصیل اقساط کی صورت میں شائع کر دی جائیں۔

اس عرصہ میں محترم پرویزؒ صاحب ملک کے دیگر رسائل و جرائد میں مضامین لکھتے رہے اور عملی طور پر بزم اقبال کے پلیٹ فارم سے مسلم لیگ کے اجلاس میں شمولیت کر کے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار انجام دیتے رہے۔ یہاں اس حقیقت کو دہرا دینا مناسب ہو گا کہ محترم پرویزؒ صاحب کے نزدیک مطالبہ پاکستان مقصود بالذات نہ تھا بلکہ یہ ایک بلند و بالا اور عظیم القدر مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی زندگی کو قرآنی خطوط پر متشکل کر سکیں اور چونکہ اس کے لئے کسی ایسے خطۂ ارض کا ہونا ضروری تھا جس میں کسی غیر کا دخل نہ ہو، اس لئے پاکستان کا حصول اس کے لئے لابدی تھا۔ اس کے سامنے یہ حقیقت واضح تھی کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ حصولِ خطۂ ارض کی کوششوں کے ساتھ ساتھ نگاہوں کے سامنے وہ خاکہ بھی رکھتے چلے جائیں جس کے مطابق اس خطۂ زمین پر ایک جدید عمارت کی تعمیر ہونی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صدر ضیاء الحق مرحوم کا نفاذِ اسلام!

حقیقت یا سراب؟

صدر ضیاء الحق مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ مستقل مزاج، ہٹ کے پکے اور ڈسپلن کے پابند تھے۔ مسئلہ افغانستان کو اُنہوں نے تدبر، ذہانت، ہمت اور استقلال کے ساتھ نبھایا۔ رُوس کی افغانستان سے واپسی ان کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھی۔ وہ اپنے ذاتی کردار، دیانت، شرافت، تہذیب اور شائستگی کی وجہ سے عوام میں مقبول تھے۔ بیواؤں، یتیموں اور غریبوں کے محسن تھے۔ یہ وہ صفات ہیں جو ذاتی طور پر ایک مسلمان کی قدر و قیمت بڑھانے کے لئے کافی ہیں لیکن ایک مملکت میں جو اسلام کے نام پر قائم کی جائے، اس میں صاحبِ اقتدار شخص کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں اور اُن سے سرخرو ہونے کے لئے قرآنِ کریم کی تعلیم کے بنیادی تصورات سے واقفیت لازمی ہے۔

مرحوم صدر، فوجی حکمران تھے۔ ذاتی طور پر اُن میں وہ خوبیاں موجود تھیں جو ایک مسلمان میں ہونا چاہئیں۔ وہ نماز، روزہ کے پابند تھے۔ قرآنِ کریم کے ساتھ جذباتی لگاؤ اس قدر تھا کہ قرآن کا نسخہ ہر وقت جیب میں رکھتے تھے۔ وہ مملکتِ پاکستان میں نفاذِ اسلام کی آرزو بھی رکھتے تھے لیکن ان تمام صفات کے باوجود قرآنِ کریم کی تعلیم سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے، نہ اُمورِ مملکت کو اسلامی سانچے میں ڈھال سکے اور نہ ہی معاشرے میں اسلامی رنگ پیدا کر سکے۔ بلکہ ان کے عرصۂ اقتدار میں معاشرے کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی جو کہ اُن کی اسلام میں قانون سازی کے اصولوں سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قانون سازی مقننہ کی بجائے عدلیہ کو سونپ دی گئی جس سے انتشار انتہا تک پہنچ گیا۔ نظامِ اسلام کا نفاذ LEGISLATION کے ذریعہ شروع کیا گیا جو کہ ناممکن العمل چیز تھی کیونکہ معاشرے میں تہذیب و شائستگی کسی آرڈی ننس، کسی مارشل لاء یا دفتری حکم کے ذریعے نہیں لائی جا سکتی۔ گذشتہ گیارہ سال کے عرصہ میں اسلام، اسلام کا شور بہت بلند ہوا، اسلامک سٹڈی (STUDY) پر بھی زور دیا گیا لیکن اس کے باوجود مار دھاڑ، بدامنی، ٹیکس چوری اور رشوت معاشرے کی ہر سطح پر شدت اختیار کر گئی۔ اخلاقی پستی اس حد تک بڑھ گئی کہ مساجد کے خطیبوں پر زنا کے مقدمات درج ہونے لگے۔ دفتروں، کارپوریشنوں اور عدالتوں میں، ہر جگہ رشوت کا دَور

قصہ رہا جس کا جی چاہے، کسی دفتر کا ریکارڈ گم کرا دے، جس کی ہمت ہو۔ اپنی مرضی کے مطابق عدالت سے فیصلہ لے لے۔ صحت اور تعلیم کے مسائل ڈراؤنی شکل اختیار کر گئے۔ گویا ملک میں ظھر الفساد فی البر والبحر، کا سماں پیدا ہو گیا۔ ہر طرف سے اعتراضات اور مخالف تبصروں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی لیکن تبصرہ نگاروں کی نگاہ پاکستان میں اسلام کے پودے کے مرجھائے ہوئے زرد پتوں تک تو گئی، اس پودے کی جڑ تک، جو دیمک زدہ ہو چکی تھی، نہ پہنچ سکی۔ کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ پاکستان میں نہ آج تک نظامِ اسلام کا نفاذ ہو سکا ہے، نہ آئندہ ہو سکے گا۔ جب تک مملکت کے آئین میں بنیادی غلطیوں کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ ان بنیادی نقائص کی وجہ سے ہر صاحب اقتدار نے قانون سازی میں من مانی کی۔ مرحوم صدر نے جس شکل میں چاہا، اسلام نافذ کر دیا۔ اگر انہوں نے بھینس کو گینڈا کہہ دیا تو کسی کو یہ پوچھنے کا حق نہ رہا کہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ عموماً ہمارے ہاں مملکت کے آئین کا تقدس اس حد تک ملحوظ رکھا جاتا ہے، جیسے یہ آسمانی صحیفہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جو انتظامی امور، آئین میں طے شدہ ہیں، ان کو روز روز بدلنا نہ مناسب ہے نہ ممکن لیکن ایک اسلامی مملکت کے آئین میں جو چیزیں قرآن کے خلاف ہوں، ان کی طرف توجہ نہ دینا کہاں تک درست ہے؟ مرحوم صدر نے شریعت آرڈی ننس نافذ کیا جس میں کہا گیا کہ:-

"لہٰذا اب اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے دستور کے آرٹیکل ۸۹ کی شق (۱) کی رُو سے تفویض کردہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے، صدر نے حسب ذیل آرڈی ننس وضع اور نافذ کیا ہے:"

اب اس مفروضہ کے تحت کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اختیارات، صدر صاحب کو تفویض ہو چکے ہیں، ہر معاملے کا حل، درست ہو یا غلط، ان کے دستِ قدرت میں آ گیا۔

اقتدارِ اعلیٰ

SOVEREIGNTY یا اقتدارِ اعلیٰ کا مسئلہ، بنیادی مسئلہ ہے، جس پر غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ جب تک یہ مسئلہ صحیح سمت اختیار نہیں کرتا، مملکتِ پاکستان میں نفاذِ اسلام ناممکن ہے! اسلامی مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ، صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ان قوانین، احکامات اور مستقل اقدار کو جو قرآن کریم کے اندر موجود ہیں اور جن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵ : ۹)"۔ اسلامی مملکت کے حکمران صرف، اُن احکام و قوانین کو نافذ کرنے کی مشینری ہوتے ہیں جو حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے وحی کے ذریعے اُمتِ مسلمہ تک پہنچے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے ..... اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ..... ۝ (۱۲ : ۴۰) "یاد رکھو! اختیارات و

اقتدارِ اعلیٰ کا مالک صرف اللہ ہے"..... وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝ (۱۸:۲۶) "اس کے قانون کے ساتھ کسی اور کے قانون کو شامل نہیں کیا جا سکتا"۔ جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ صرف اس کی کمانڈ COMMAND کے تابع ہوتا ہے۔ مظاہرِ فطرت یا خود انسانوں میں سے کسی کو انسان سے برتر سمجھ کر خدائی اختیارات میں شریک کر لینا اور خود اپنے آپ کو اس سے فروتر سمجھ لینا ظلم ہے **توحید کا مطلب یہ ہے کہ** دنیا میں خدا کے علاوہ، انسان سے برتر کوئی نہیں۔ لہٰذا اس کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔

..... وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ (۱۸:۱۱۰)

"اپنے رب کی محکومیت میں کسی کو شریک نہ کرے"

لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ انسانوں کو براہِ راست حکم نہیں دیتا بلکہ یہ احکام وحی کے ذریعے انبیاءِ کرامؑ کی وساطت سے ملتے ہیں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا..... ۝ (۶:۱۱۵)

"ان سے پوچھو، کیا تم چاہتے ہو، کہ میں اللہ کو چھوڑ کر، کسی اور کے قانون کے مطابق تمہارے معاملات کے فیصلے کرنے لگ جاؤں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطہ، قوانین بھیجا ہے"!

چنانچہ ایک اسلامی مملکت میں، اقتدارِ اعلیٰ، کِتٰبٌ مُّفَصَّلًا (قرآن کریم) کو حاصل ہے اور اسلامی مملکت کی مشینری، صرف قرآن کے احکام نافذ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسے خود اپنے احکام نافذ کرنے کا حق حاصل نہیں۔ پھر کہا۔

..... فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ..... ۝ (۵:۴۸)

"اب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے اسی کتاب کے مطابق کرو۔ (اور اس قسم کے حقائق مل جانے کے بعد لوگوں کے خیالات و خواہشات کے پیچھے پیچھے مت چلو"

چنانچہ اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی، احکامِ خداوندی (جو قرآن کریم کے اندر موجود ہیں) کے نفاذ کی ذمہ دار ہے۔ اس مرکزی اتھارٹی کی اطاعت افرادِ اُمّت کے لئے لازمی ہے۔ جس کے نتیجے میں افراد کے وحدتِ عمل (COORDINATED FUNCTIONING) کا وجود میں آنا لازمی ہے۔ اگر کہیں ملّت کے افراد میں وحدتِ عمل نہیں پائی جاتی تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ یا تو افراد، مرکزی اتھارٹی کے احکام کا اتباع نہیں کرتے یا مرکزی اتھارٹی، اللہ کے احکام جاری کرنے کی بجائے، خود ساختہ قوانین جاری کر رہی ہے۔ چنانچہ اللہ پر ایمان، قوانینِ خداوندی (جو اللہ کی کتاب کے اندر موجود ہیں) کا نفاذ اور ان احکام کو نافذ کرنے

والی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت، اس سلسلے کی کڑیاں ہیں، جن سے اُمّت میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔
قرآن کریم مرکزی اتھارٹی کی اطاعت پر زور دیتا ہے، لیکن مرکزی اتھارٹی، اگر اللہ کے قانون کی بجائے، انسانوں کے خود تراشیدہ تصوّرات نافذ کرنے بیٹھ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ انتشار ہوگا اور مملکت میں نظامِ اسلام کا نفاذ ناممکن العمل شے بن جائے گا۔ اللہ کی (SOVEREIGNTY) اقتدارِ اعلیٰ کی تفویض کا نظریہ قطعاً غلط اور غیر قرآنی ہے۔ جب تک پاکستان کے آئین کی آرٹیکل ۸۹ شق ۱ سے تفویض کا لفظ خارج نہ کیا جائے، اس وقت تک اس مملکت میں دینِ اسلام کا نفاذ ناممکن ہے۔ کیونکہ اس سے ہر وہ شخص جو برسرِ اقتدار آئے گا، اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو ذاتی اقتدار میں بدل کر رکھ دے گا۔ تفویض کے تصوّر نے عیسائیت میں جنم لیا جہاں یہ پاپائیت (THEOCRACY) کی بنیاد بنا۔ عیسائی بادشاہوں نے اسی میں ترمیم کر کے 'DIVINE RIGHTS OF KINGS' کی بنیاد رکھی۔ اس سے بادشاہوں کے اقتدارِ اعلیٰ کا تصوّر عملی طور پر رواج پا گیا۔ اور جب مسلمانوں میں خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو مسلمان بادشاہوں نے اس تصوّر کو اپنا لیا کیونکہ یہ ان کے ذاتی مفاد میں تھا اور وہ اپنے آپ کو ظلّ اللہ علی الارض، زمین پر خدا کا سایہ تصوّر کرنے لگے۔ اس کے بعد مسلمان بادشاہوں نے دنیاوی امور اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور دینی معاملات، مذہبی پیشواؤں کے سپرد کر دیئے۔ جب تک ملوکیت قائم رہی، یہ پاپائیت کا سہارا لیتی رہی اور پاپائیت، ملوکیت کے بل بوتے پر قائم رہی۔ یہ گٹھ جوڑ مسلسل جاری رہا جس کے نتیجے میں دینِ اسلام (جو حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی قوانین کے تحت رائج کیا تھا اور جس میں مرکزی اتھارٹی، قرآنِ کریم کے قوانین و مستقل اقدار کے نفاذ کی ذمہ دار تھی) نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔

برِصغیر میں، غیر مسلموں کی حکمرانی کے بعد، علامہ محمد اقبالؒ اور پھر قائداعظم محمد علی جناحؒ نے پھر سے دینِ اسلام کی بنیاد پر مملکت کے قیام کا بیڑہ اُٹھایا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، دین کی بنیاد پر مملکت کے قیام میں مرکزی نقطہ یہ ہے کہ امورِ مملکت میں اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کو عملاً نافذ کیا جائے۔ مملکتِ پاکستان کے بانیوں نے علی الاعلان کہا کہ یہاں THEOCRACY رائج نہیں ہوگی، دوسرے الفاظ میں ملوکیت کے کندھوں پر سوار، پاپائیت کا اقتدار قائم نہیں ہوگا۔ لیکن جس تصوّر کے خلاف اقبالؒ اور قائداعظمؒ تھے، اُسی مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کو بروئے کار لانے کا بیڑہ مرحوم صدر ضیاء الحق نے اُٹھا لیا۔ اس کے لئے آئین کے آرٹیکل نمبر ۸۹ کی شق نمبر ۱ کو جس میں اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ اور اختیارات کو تفویض کرنے کا ذکر ہے، بنیاد بنایا گیا۔ اللہ کے اختیارات تفویض کرنے

کا تصور قطعاً غیر قرآنی ہے۔ اسے ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے 'زید' اپنے اختیارات 'بکر' کو تفویض کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اختیارات کا (ABSOLUTE CONTROL) قطعی استعمال 'بکر' کے ہاتھ میں رہے گا۔ یعنی وہ اپنی مرضی سے، جس طریق سے چاہے، ان اختیارات کو استعمال کر سکے گا۔ اس دوران زید کا ان اختیارات پر کنٹرول معطل رہے گا۔ اس میں دوسرا نقطہ یہ ہے کہ ایک اتھارٹی کا دوسری اتھارٹی کو اختیارات تفویض کرنے کا طریقہ اس وقت آتا ہے جب تفویض کرنے والی اتھارٹی غیر حاضر ہو لیکن اللہ تعالیٰ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہیں۔ اس کے کسی وقت یا کسی موقع پر غیر حاضر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات نہ صرف کسی کو تفویض نہیں کرتا بلکہ ان میں کسی دوسرے کی شراکت بھی قبول نہیں کرتا حتیٰ کہ انبیائے کرامؑ کو بھی نہیں جو خود بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہوتے ہیں۔

اب اس بات پر غور کیجئے کہ مذہبی پیشوائیت نے اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کی تفویض کے لئے کس قسم کی من گھڑت کہانی بنائی؟ ملاّ کہتا ہے کہ انسان، خلیفۃ اللہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اللہ کی اتھارٹی (اقتدار و اختیار) کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ جب کہ قرآن میں کسی ایک جگہ بھی انسان کو خلیفۃ اللہ نہیں کہا گیا۔ جب اللہ نے ملائکہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اِنِّی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ" میں روئے زمین پر خلیفہ کی تخلیق کرنے والا ہوں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ روئے زمین پر جو پہلی نسلیں (تخلیقات، مخلوق) یکے بعد دیگرے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی ہیں، میں ان کے جانشین (SUCCESSOR) کی تخلیق کرنے والا ہوں۔ اس نقطہ کی وضاحت کہ انسان خلیفۃ اللہ نہیں، از روئے قرآن کی جاتی ہے۔

لفظ خلیفہ کا مادہ ہے خ ل ف۔ اس مادہ میں تین بنیادی تصورات ہیں۔ (i) TO SUCCEED یعنی ایک کے بعد دوسرے کا آنا۔ (ii) TO FOLLOW یعنی ایک کا دوسرے کے پیچھے پیچھے چلنا اور (iii) TO UNDERGO CHANGE یعنی تبدیلی واقع ہونا۔ قرآنِ کریم اپنے یہ مطالب خود واضح کرتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:-

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً ..... ○ (۲۵:۶۲)

"اور جس نے خارجی کائنات میں ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ، رات اور دن ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں"

بکر، زید کا خلیفہ، صرف اس کی عدم موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے، زید (چاہے زندہ ہو یا مُردہ) کی موجودگی میں اس کا خلیفہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اب دیکھئے اس نظریہ کی تائید میں قرآنِ کریم کیا کہتا ہے:-

جب حضرت موسیٰؑ پہاڑ پر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے گئے تو انہوں نے جانے سے پہلے اپنی بھائی ہارونؑ سے کہا.... وَقَالَ مُوسٰی لِاَخِیۡهِ هٰرُوۡنَ اخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ.....٥ (۷-۱۴۲)

"(پھر ایسا ہوا کہ موسیٰؑ ہمارے حکم سے ایک ماہ دس دن کے لئے الگ ہوا) تو اس نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ تم میری عدم موجودگی میں میری جانشینی کرو۔"

ایک دوسری جگہ کہا گیا:

ثُمَّ جَعَلۡنٰکُمۡ خَلٰٓئِفَ فِی الۡاَرۡضِ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لِنَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ٥ (۱۰:۱۴)

"ان اقوامِ سابقہ کے بعد ہم نے تمہیں ان کا جانشین بنایا کہ یہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔"

ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:-

.... وَیَسۡتَخۡلِفُ رَبِّیۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ.....٥ (۱۱:۵۷)

"(اب تم دیکھو گے کہ خدا کا قانونِ مکافات کس طرح تمہیں تباہ و برباد کر کے) تمہاری جگہ ایک اور قوم کو لے آتا ہے۔"

قومِ عاد کے متعلق کہا گیا:-

وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ.....٥ (۷:۶۹)

"تم سوچو کہ (قومِ نوحؑ کیوں تباہ ہوئی؟ اس لئے کہ اس نے غلط روش اختیار کر رکھی تھی) اس کے بعد اللہ نے تمہیں اس کا جانشین بنا دیا۔"

چنانچہ قرآن کریم صاف الفاظ میں واضح کرتا چلا جا رہا ہے کہ بکر، زید کی عدم موجودگی میں یا اس کی موت کے بعد ہی اس کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کوئی انسان، اللہ کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور موجود ہے۔ لفظ خلیفۃ اللہ، ان لوگوں کی ایجاد ہے جو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کے نام پر، عوام الناس کا استحصال کرنا چاہتے ہیں۔ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو انہوں نے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۃ الرسول ہوں۔ چنانچہ استخلاف فی الارض کا مطلب، اللہ تعالیٰ کے غیر متبدل قوانین کو امورِ مملکت میں عملاً نافذ کرنے کے لئے اقتدار حاصل کرنا ہے۔ ایک اسلامی مملکت اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین اور مستقل اقدار کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قوانین غیر متبدل

ہیں.... وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ..... ۵ (۶:۳۴) "خدا کا قانون اٹل ہے، اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرسکتا"۔ حتیٰ کہ انبیائے کرامؑ بھی اس کے مجاز نہیں۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ۵ (۳:۱۲۸) "(اے اللہ کے رسول!) اللہ کے قوانین بدلنے کا تمہیں اختیار نہیں دیا گیا"۔

اللہ، اَلٰہ ہے یعنی صرف اسی کی ذات صاحبِ اقتدار ہے (THE ONLY SOVEREIGN) اسی کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے۔ اور بنی نوعِ انسان کے لئے اس کے قوانین کا اتباع لازم ہے۔ دین کی عمارت "اِلٰہ" کے صحیح مفہوم پر استوار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ حاکمِ مطلق، واحد حکمران ہے۔ سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے۔ "حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری" ارشادِ خداوندی ہے:

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ ۵ (۱۶:۵۱)

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں دیکھنا تم کہیں دو اِلٰہ نہ بنالینا۔ اِلٰہ وہی ایک ہے"۔

اللہ تعالیٰ کے اختیارات تفویض کرنے کا مطلب ایک سے زیادہ اِلٰہ بنالینا ہے۔ چنانچہ اسلامی مملکت میں مومنین کی مرکزی کمانڈ (COMMAND) صرف اللہ کے غیر متبدل قوانین کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہے۔ اور قانون سازی میں اس کا دائرہ اختیار، ان غیر متبدل قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، صرف (BY-LAWS) جزئی قوانین بنانے تک محدود ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی مملکت کے قوانین، متبدل اور غیر متبدل عناصر کا حسین امتزاج ہیں۔ اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی، غیر متبدل قوانین و مستقل اقدار کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے، زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق جزئی قوانین (BY-LAWS) بناتی ہے۔ چنانچہ اسلامی مملکت کے قوانین کا یہ حصہ، جو باہمی مشاورت سے طے پاتا ہے، "متبدل" ہوتا ہے۔

قرآن و سنّت

اب آیئے شریعت آرڈی ننس کے دوسرے اہم پہلو کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ شریعت سے مُراد، اسلام کے وہ احکام ہیں جو قرآن پاک اور سنّت میں مرقوم ہیں۔ اس ضمن میں بہت لمبے چوڑے مباحث ہو چکے ہیں۔ میرے ذہن میں اس مسئلہ سے متعلق ایک قسم کا اشکال و ابہام موجود تھا اور جن احباب سے میں نے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا، انہیں بھی کم و بیش اس اشکال میں مبتلا پایا۔ ۱۹۵۹ء میں آئین کمیشن کا سوالنامہ شائع ہونے کے بعد ۱۹ علماء کے متفقہ جوابات سامنے آئے۔ اِن علماء کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ آئین کی بنیاد کتاب و سنّت پر ہو۔ چنانچہ مئی ۱۹۶۰ء میں، میں نے اس اشکال کے حل کے لئے اِن علمائے کرام کی طرف رجوع کیا۔ اور ایک خط کے ذریعے اپنے مقصد اور نقطۂ نظر کو پوری وضاحت سے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ میرے سوالات

مندرجہ ذیل تھے:-

i آپ کے نزدیک سنّت سے کیا مُراد ہے؟ یعنی جس طرح 'کتاب' سے مُراد قرآنِ مجید ہے، بعینہٖ اسی طرح 'سُنت' سے کیا مُراد ہے؟

ii کیا (قرآن کریم کی طرح) ہمارے ہاں کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں سنّتِ رسول اللہ مرتّب شکل میں موجود ہو یعنی قرآن کی طرح، اس کی بھی کوئی جامع و مانع کتاب موجود ہے۔

iii کیا سنت رسول اللہ کی اس کتاب کا متن (TEXT) تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآنِ مجید کا متن؟

iv اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآنِ مجید کی آیت ہے، اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سُنّتِ رسول اللہ ہے یا نہیں؟

میرا خیال تھا کہ اگر ان علمائے کرام کی طرف سے میرے مختصر سے سوالات کے متعیّن اور اطمینان بخش جوابات موصول ہو گئے تو اُن کی اشاعت سے بہت سی اُلجھنیں دور ہو جائیں گی اور فکری وحدت کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ لیکن ان حضرات میں سے صرف سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے ہی اپنی قلم کو حرکت میں لانا ضروری سمجھا اور وہ بھی اس طرح کہ واضح اور دوٹوک جوابات کی بجائے انہوں نے میری توجہ اس مراسلت کی طرف دلائی جو اُن کے اور جسٹس رحمٰن صاحب کے درمیان ہوئی تھی اور جو ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۹ء اور دسمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ مودودی مرحوم نے مجھے یہ ہدایت فرمائی کہ میں اس کا مطالعہ کروں کیونکہ میرے سوالات کا جواب، اس خط و کتابت میں موجود ہے۔ اس مراسلت کو پڑھنے کے بعد میں مطمئن نہ ہو سکا، چنانچہ مزید وضاحت کے لئے میں نے مودودی صاحب کی خدمت میں چند اور سوالات پیش کئے۔ اس پر مولانا نے جوابی مراسلت کو طول طویل تحریروں کا اکھاڑہ بنا دیا۔ یہ مراسلت ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ہر شخص اب بھی دیکھ سکتا ہے کہ آیا مودودی مرحوم میرے ابتدائی سوالات اور بعد ازاں دلائل کا جواب دے سکے تھے یا نہیں۔ جو کچھ میں نے ان کی تحریروں سے اخذ کیا وہ یہ تھا کہ دل سے مودودی مرحوم بھی یہی سمجھتے تھے کہ سنّت کی وہ پوزیشن نہیں جو وہ ظاہر کر رہے تھے لیکن اس کے اعتراف کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے تھے اور اپنی اس کمزوری کو طویل نویسی، طعن و تشنیع اور استہزاء کے گھناؤنے پردوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے رہے ہیں نے مودودی مرحوم کے آخری خط کا جواب جنوری ۱۹۶۱ء میں بھیج دیا تھا۔ لیکن انہوں نے اسے شائع نہ کیا۔ اور نہ ہی وہ متعیّن طور پر فرماتے تھے کہ وہ اسے کب شائع کریں گے۔ اس کے بعد بھی میں ان کو یاد دہانی کراتا رہا۔ آخر ایک لمبی خاموشی کے بعد، انہوں نے ۳ جون ۱۹۶۱ء

کو مجھے ایک پوسٹ کارڈ بھیجا جس میں انہوں نے لکھا "اس سلسلۂ مراسلت کو بلا نہایت جاری رکھنے کی ضرورت نہیں ہے چنانچہ آپکو اس خط کا جواب دینے کی بجائے میں نے اس پر مفصل تبصرہ کر دیا ہے۔ آپ کا خط اور میرا تبصرہ، انشاء اللہ عنقریب ترجمان القرآن میں شائع ہو جائیں گے۔ ان کو کتابت کے لئے دے رکھا ہے۔"

یوں مودودی مرحوم نے اپنے حواریوں کو مطمئن کرنیکی خاطر تبصرہ شائع کر کے مراسلت سے پیچھا چھڑا لیا۔ لیکن میرے سوالات کا دو ٹوک جواب آخر تک نہ مل سکا۔

میرا پہلا سوال یہ تھا کہ آپکے نزدیک سُنّت سے کیا مراد ہے! یعنی جسطرح کتاب سے مُراد قرآن ہے، اسی طرح سنّت رسول اللہ سے کیا مراد ہے؟

اس کا جو جواب مودودی مرحوم نے دیا تھا وہ مختصراً یوں تھا "محمدی تعلیم وہ بالاتر قانون ہے جو حاکم اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ قانون محمدؐ سے ہمیں دو شکلوں میں ملا ہے۔ ایک قرآن جو لفظاً بلفظاً خداوندِ عالم کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ دوسرے محمدؐ کا اسوۂ حسنہ یا آپکی سُنّت جو قرآن کے منشاء کی توضیع کرتی ہے۔ محمدؐ، خدا کے صرف نامہ بر نہیں، وہ اس کے مقرر کئے ہوئے رہنما، حاکم اور معلّم بھی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور عمل سے قانونِ الٰہی کی تشریح کریں، اس کا صحیح منشاء سمجھائیں۔ اس کے منشاء کے مطابق افراد کی تربیت کریں۔ پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دے کر، معاشرہ کی اصلاح کے لئے جدّوجہد کریں۔ پھر اس اصطلاح شدہ معاشرہ کو ایک صالح و مصلح ریاست کی صورت دے کر یہ دکھائیں کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے؟ آنحضرتؐ کا یہ پورا کام جو ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں آپ نے سرانجام دیا، یہ سنّت ہے، قرآن کے ساتھ مل کر حاکمِ اعلیٰ کے قانونِ برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے۔ اور اسی قانونِ برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے۔"

میرا دوسرا سوال تھا۔ کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں سنّتِ رسولؐ مرتب شکل میں موجود ہو یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و مانع کتاب ہو!

مودودی صاحب کا جواب مختصراً۔ "ڈیڑھ ہزار سال قبل جو نبوّت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنّت چھوڑی تھی۔ ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور محمدؐ کی سنّت پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز کے پہلے دن قائم ہوا، وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے۔ اس کی زندگی میں ایک دن کا انقطاع واقع نہیں ہوا ہے۔ اور اس کے تمام ادارے، اس ساری مدّت میں بیہم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد، طرزِ فکر، اخلاق و اقدار، عبادت و معاملات، نظریۂ حیات اور طریقِ حیات سے جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس میں اختلاف بہ نسبت ہم آہنگی کا عنصر

بہت زیادہ ہے۔ جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک اُمّت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ وہ سنّت جو ان طویل صدیوں کے دوران مسلسل جاری رہی۔ دوسری تاریخی حقیقت جو اتنی ہی روشن ہے یہ ہے کہ نبیؐ کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ جاننے کی پیہم کوشش کرتے رہے کہ سنّتِ ثابتہ کیا ہے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافتؓ کے زمانے سے لے کر آج تک نسلاً بعد نسلٍ میراث میں ملے ہیں اور ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔"

اب دیکھیے کہ مودودی مرحوم نے میرے دوسرے سوال کے جواب میں فرمایا۔

کہ وہ معاشرہ جو اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا، وہ اُسوقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے اور تمام مسلمانوں کے عقائد، طرزِ فکر، اخلاق واقدار، عبادات ومعاملات، نظریۂ حیات اور طریقِ حیات میں جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے اور وہ سنّت طویل صدیوں کے دوران مسلسل جاری ہے۔"

پھر مودودی مرحوم نے فرمایا کہ "حضورؐ کی سُنّتیں مسجد سے لے کر خاندان، منڈی، عدالت، ایوانِ حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے جو حضورؐ کی زندگی ہی میں عملاً آمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدینؓ کے عہد سے لے کر دورِ حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے۔"

اب یہ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ مودودی مرحوم کا مندرجہ بالا بیان کس قدر حقیقت سے دُور ہے۔ رونا تو اسی بات کا ہے کہ وہ معاشرہ اور وہ ادارے جو حضورؐ نے قرآن کے احکام کو نافذ کرنے کے لئے اپنی زندگی میں قائم فرمائے تھے، باقی نہیں رہے اور ان کو دوبارہ نافذ کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوبارہ قرآن کی طرف رجوع کیا جائے۔ پاکستان کے اندر جو حالت ہے وہ میں شروع میں بیان کر چکا ہوں۔ دیگر اسلامی ممالک پر بھی نظر دوڑائیے۔ وہاں وہ معاشرہ اب کہاں موجود ہے جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ متنازعہ غیر قرآنی باتوں کو چھوڑ کر جس پر ہماری پیشوائیت کا انحصار ہے، حضورؐ کی سنّت کو خود قرآن کے اندر تلاش کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔

جو کچھ آج مسلم معاشرے میں ہو رہا ہے، کیا اسے دیکھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں، اللہ پر ایمان بعینہٖ اُسی طرح موجود ہے جس طرح یہ قرآن نے بیان کیا ہے۔ کیا آج مسلمانوں میں، قانونِ مکافاتِ عمل کا تصور موجود ہے؟

قرآنِ کریم نے کہا ہے:-

وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيٓ ءَادَمَ ...... ۝ (۷۰ : ۱۷)

"یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے"
اس لئے ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب الاحترام قرار پاتا ہے۔ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم کیا تھا، یہ اس کا اہم ترین جزو تھا۔ لیکن آج ذات پات، حسب نسب اور رنگ و نسل کے امتیازات نے مسلم معاشرے کا رنگ یکسر بدل دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں طور پر واجب الاحترام ہیں لیکن اس کے آگے احترام کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق متعین ہوں گے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجَٰتٌ مِّمَّا عَمِلُواْ ...... (۱۹ : ۴۶) "ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق مرتب ہوں گے"۔ لیکن آج مسلم معاشرے میں، مدارج اعمال کی بجائے، دولت کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ ایک شخص آپ سے ملنے کے لئے پیدل یا تانگے میں بیٹھ کر آتا ہے، آپ کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر آتا ہے تو آپ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ گاڑی کرائے کی ہے یا اپنی؟ اگر اپنی ہے تو دیکھا جائے گا گاڑی کا ماڈل کون سا ہے۔ جو بہت قیمتی گاڑی میں بیٹھا ہو، اس کا درجہ بہت بلند سمجھا جائے گا۔ چاہے وہ سمگلر ہی ہو۔ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا۔ اس میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ غلام اُونٹ کے اُوپر بیٹھا ہے اور آقا اونٹ کی مہار پکڑے چلا آ رہا ہے۔ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا وہ عدل کی بنیاد پر تھا یعنی تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں سمجھا جاتا تھا۔ ہر ایک کے لئے، اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کیا جاتے تھے۔ اور سعی و عمل کے لحاظ سے، ان کے مدارج متعین کئے جاتے تھے ان کی محنت کے مطابق ان کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ کسی کے حقوق و واجبات کو سلب نہیں کیا جاتا تھا اور تمام امور کے فیصلے اس قانون کے مطابق ہوتے تھے جو سب پر یکساں طور سے نافذ تھا۔ إِنَّ ٱللَّهَ يَأۡمُرُ بِٱلۡعَدۡلِ ...... ۝ (۱۶ : ۹۰) "یقیناً اللہ عدل کا حکم دیتا ہے"۔ کہاں ہے وہ نظامِ عدل جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ آج اس عدل کا کہیں شائبہ تک بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ بڑ ہانکنا کہ آج بھی مسلم معاشرہ میں وہ نظامِ عدل موجود ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا، آسان بات ہے لیکن اگر موجودہ زمانے میں اپنے گردو پیش نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا کہ ایسا کرنا نِرا پاگل پن ہے۔ حضورؐ نے جو معاشرہ

قائم فرمایا تھا اس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں تھا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... ○ (۳:۷۸)

"کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اُسے ضابطہ، قوانین، حکومت اور نبوّت عطا کرے اور وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ خدا سے ورے میرے غلام اور محکوم بن جاؤ۔"

حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا، اس میں نہ عوام کو حق حاصل تھا نہ اجرائیہ (EXECUTIVE) کو کہ کسی فرد کو اپنی مرضی کے مطابق چلائے حتیٰ کہ خود نبیؐ کو بھی یہ حق حاصل نہیں تھا کہ لوگوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنائیں۔

حضورؐ نے جس زمانے میں معاشرہ قائم فرمایا تھا وہ "یَوْمُ الدِّیْنِ" تھا۔ ملّا نے تو یوم الدّین کو صرف آخرت پر اُٹھا رکھا ہے۔ اس کے نزدیک یوم الدّین کا اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں لیکن قرآن نے خود غیر مبہم اور واضح انداز میں بتا دیا کہ یوم الدّین کیا ہے؟ کہا کہ:-

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۸۲:۱۷)

"اور تمہیں کیا معلوم کہ یوم الدّین کیا ہے"؟

پھر قرآن خود اس کا جواب دیتا ہے کہ

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (۸۲:۱۹)

"یہ وہ دور ہوگا جس میں (ہر انسان اپنے اعمال کو سامنے دیکھے گا اور) کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار نہیں ہوگا۔ اختیارات تمام کے تمام قوانینِ خداوندی کے لیے مختص ہوں گے۔ حکومت صرف اُسی کے قوانین کی ہوگی (یعنی وہ دور جس میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم ہوگا نہ محتاج)"

لیکن آج مسلم معاشرہ میں ہر طرف استحصالی قوتیں کارفرما ہیں۔ فرعونوں (POLITICAL EXPLOITERS) ہامانوں (RELIGIOUS AND INTELLECTUAL EXPLOITERS) اور قارونوں (ECONOMIC EXPLOITERS) نے انسانیت کو اپنے خود ساختہ قوانین کے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔

یہ درست ہے کہ کوئی معاشرہ اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا اور نہ باقی رہ سکتا ہے جب تک افراد پر کچھ پابندیاں عائد نہ ہوں۔ از روئے قانون یہ پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور اس قانون

ی اصولی حدود، وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعیّن ہوتی ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے، قانون کی حکمرانی کی بنا پر معاشرہ قائم فرمایا تھا۔ لیکن آج کہاں ہے اس قانون کی حکمرانی جو وحی کے ذریعے حضورؐ کو ملا تھا۔ مسلم معاشرے میں آج جو قانون بھی رائج ہے وہ یا تو کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر کے ذہن کی پیداوار ہے یا مذہبی پیشوائیت کا خود تراشیدہ ہے۔ اور یا سرمایہ داروں، جاگیرداروں کا عوام النّاس کا خون چوسنے (PARASITISM) کا قانون ہے۔ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا، وہ نہ صرف عدل بلکہ احسان کی بنیاد پر قائم تھا۔ لیکن آج کا مسلم معاشرہ جس میں عدل کا نام و نشان نہیں، اس میں 'احسان' کا تو نام لینا ہی بے معنی ہے۔ حضورؐ نے عدالتوں کے اندر جو نظام قائم فرمایا تھا، اس میں نہ حق اور باطل کو خلط ملط کیا جاتا تھا، نہ حق کو چھپایا جاتا تھا نہ شہادت کو پوشیدہ رکھا جاتا تھا۔ گواہ کی گواہی کی بنیاد سچائی پر ہوتی تھی، چاہے شہادت خود اس کے اپنے خلاف جائے یا اس کے عزیز و اقارب کے خلاف، مقدمہ چاہے غریب کا ہو یا امیر کا۔ خائن کی وکالت نہیں کی جاتی تھی۔ جو لوگ اپنے ضمیر کے خلاف جائیں اور جو گنہگار ہوں، ان کی وکالت ممنوع تھی۔ لیکن آج مسلم معاشرے میں جو عدالتوں کی حالت ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ہر شخص شہادت دینے سے پیشتر حلف اُٹھاتا ہے کہ وہ جو کہے گا سچ کہے گا اور اس کے بعد مسلسل جھوٹ بولتا چلا جاتا ہے۔ ہر صاحبِ استطاعت شخص اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ لے سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ پیسہ خرچ کرے اور سفارش کرا سکے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا، اس میں افراد کے جسم اور ذات کی نشوونما کی ذمہ داری حکومت پر تھی۔ افراد کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا حکومت کے ذمہ تھا اور افرادِ معاشرہ کے لیے اپنی بنیادی ضروریات سے زائد خرچ کرنا منع تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہ کوئی محل تعمیر کیے تھے نہ کوئی جائیداد چھوڑی تھی۔ لیکن آج کا مسلم معاشرہ ملاحظہ فرمائیے۔ ہر شہر، ہر قصبہ، اور ہر گاؤں میں ایک طرف وہ لوگ بیٹھے ہیں جن کو دو وقت کی روٹی ملنا محال ہے۔ تن پر بوسیدہ کپڑے، رہائش ایسے مکانات کے اندر جو حیوانات تک کے لیے مضرِ صحت ہیں۔ بیمار ہو جائیں تو دوا کے لیے پیسہ نہیں۔ ان کے بچوں کے لیے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ جن کے فلک بوس محلات کی تعمیر مسلسل جاری ہے اور ہر گلی کوچے اور سڑک پر جاری ہے۔ ان میں سے ہر ایک عیش و عشرت کے سامان کی فراہمی اور محلات کی تعمیر میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوششوں میں مگن ہے۔ دیہات میں بڑے بڑے

زمیندار، خدا بنے بیٹھے ہیں۔ پاکستان کو چھوڑ کر عرب ممالک کی طرف نگاہ دوڑائیے۔ کیا آج وہاں وہی معاشرہ موجود ہے جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا۔ کیا حضورؐ کے زمانے میں سرزمینِ حجاز پر ایسے لوگ موجود تھے جو ایک 'باز' خریدنے پر لاکھوں روپے خرچ کرتے تھے اور یورپ کے ہوٹلوں میں جا کر عیش و عشرت کو انتہائی بلندیوں پر پہنچاتے تھے۔ مودودی مرحوم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ آج منڈیوں تک میں وہ معاشرہ موجود ہے جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا لیکن آج جس طرح سے منڈیوں اور بازاروں میں استحصالی قوتیں کارفرما ہیں اور جس طریق سے بنکوں میں 'سود' کا نام 'منافع' رکھ کر 'ربوٰا' کو جائز قرار دیا گیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے کیا یہ وہی معاشرہ ہے جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا۔ اس میں قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار، مملکت کے اُمور کی حدود متعین کرتی تھیں۔ صرف روزمرّہ کے معاملات، زمانے کے حالات کے مطابق ان مستقل اقدار کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے طے پاتے تھے لیکن آج مسلم معاشرے میں مستقل اقدار کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔

حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا، اس میں امانت اُن لوگوں کے سپرد کی جاتی تھی جو اس کے اہل ہوں۔ نظامِ مملکت کو چلانا سب سے بڑی ذمّہ داری ہے جو کسی فرد یا افراد کو سونپی جا سکتی ہے لیکن آج اسلامی معاشرے میں حکومت، اِلّا ماشاء اللہ ہر جگہ نااہلوں کے سپرد ہے۔ ہر کس و ناکس، جو اسلام کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو، اسلامی مملکت کا سربراہ بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ مودودی مرحوم نے فرمایا تھا کہ وہ تمام ادارے جو حضورؐ نے قائم کیے تھے، آج بھی اسی طرح قائم ہیں، ان میں کوئی فرق رُونما نہیں ہوا چنانچہ حضورؐ کی سنّت کوئی گمشدہ چیز نہیں ہے کہ آج اس کی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج اس معاشرے کے معمولی خط و خال بھی بمشکل نظر آتے ہیں جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا۔ حضورؐ کی سنّت آج اگر کہیں مل سکتی تو قرآن اور صرف قرآن کے اندر مل سکتی ہے جو خدائی تحفظات کے ساتھ اور اس کی حفاظت کی ذمّہ داری کے ساتھ ہر قسم کی انسانی دست بُرد اور ارضی و سماوی حوادث سے محفوظ ہے۔ لیکن مودودی مرحوم مجھے اس بازار کی طرف کھینچتے تھے جس میں ہر ملّا نے 'سنّتِ رسولؐ' کا الگ الگ ماڈل سجا رکھا ہے۔ جہاں وحدتِ اُمّت گم ہے اور ہر طرف انتشار ہی انتشار ہے۔ مودودی مرحوم اسی انتشار کو سنّتِ رسولؐ کا منبع قرار دیتے تھے۔ دل میں وہ سمجھتے تھے کہ اس بازار میں سنّتِ رسولؐ دستیاب نہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد خود انہوں نے بھی اعلان کر دیا کہ پاکستان میں قرآن و سنّت کی بنا پر معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا (ایشیا، ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء) اس لیے یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔

اسے پھر دہرائیے کہ میرا دوسرا سوال کیا تھا۔ اور اس کا جواب مودودی مرحوم نے کیا دیا تھا۔ میرا سوال یہ تھا کہ "کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں سنّت رسول اللہ مرتّب شکل میں موجود ہو؟" مودودی مرحوم کا جواب تھا کہ اس کا (سنتِ رسول اللہ کا) کتاب کی شکل میں موجود ہونا ضروری نہیں۔ حضورؐ کی سنّت پر جو معاشرہ، اسلام کے پہلے دن قائم ہوا تھا۔ وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے۔ اب قارئین خود اندازہ لگائیں کہ وہ معاشرہ آج زندہ ہے یا نہیں اور اگر زندہ ہے تو کہاں؟

اب آیئے میرے تیسرے اور چوتھے سوال کی طرف! میرا تیسرا سوال یہ تھا کہ "کیا سنّت رسول کی اس کتاب کا متن" تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآن کریم کا متن اور چوتھا سوال یہ تھا کہ "اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے، اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائیگا کہ فلاں بات سنّت رسول اللہ ہے یا نہیں؟"

مودودی مرحوم نے اس کا جواب دیا تھا کہ "بلاشبہ سنّت کی تحقیق اور اس کے تعیّن میں بہت سے اختلافات ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایسے ہی بہت سے اختلافات، قرآن کے بہت سے احکام و ارشادات کے معنی متعیّن کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات اگر قرآن کو چھوڑ دینے کی دلیل نہیں بن سکتے تو سنّت کو چھوڑ دینے کے لیے انہیں دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

اس کے جواب میں، میں نے مودودی صاحب کو لکھا تھا۔ "اجی حضرت، متن اور اس کی تعبیرات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآن کے متن میں کسی ایک حرف کے متعلق بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ باقی رہیں اس کی تعبیرات، سو وہ انسانی فعل ہے جو کسی دوسرے کے لیے دین کی سند اور حجت نہیں ہو سکتا! اس کے برعکس احادیث کی تعبیرات میں نہیں ان کے متن میں ہی اختلاف ہے۔ ایک فرقہ، ایک حدیث کو رسول اللہ کا قول مانتا ہے تو دوسرا اسکے قولِ رسولؐ ہونے سے یکسر انکار کرتا ہے۔

مودودی مرحوم نے لکھا تھا کہ سنّتوں کے متعلق اس قسم کے اختلافات سے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہیں آتی میں نے جواب دیا تھا کہ "اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے خدا کا کلام نہیں مانتا تو کیا اس سے اس کے ایمان پر کوئی آنچ آئے گی یا نہیں۔ اگر آنچ آئے گی تو پھر قرآن اور حدیث کو یکساں وحی قرار دینا کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ کچھ سمجھا آپ نے کہ متن کے اختلاف اور تعبیرات کے اختلاف میں کتنا بڑا فرق ہے؟ لیکن آپ

اسے کیا سمجھیں گے جو قرآن کے متعلق کہہ رہے ہیں کہ "اگر احکام اخذ کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہو تو الفاظ میں اتفاق سے کیا فائدہ"؟ آپ کی اس بزالی منطق کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے (معاذ اللہ) قرآن کے الفاظ کو محفوظ رکھنے میں فاحق اتنا اہتمام فرمایا۔ جب لوگوں نے اس سے مختلف تعبیرات لے لینی تھیں تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا کہ الفاظ محفوظ ہیں یا نہیں۔ جس شخص کا قرآن اور اس کی حفاظت کی غرض اور فائدہ کے متعلق یہ ایمان ہو، میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کس سطح پر گفتگو کیجئے؟ قرآن کے متن سے احکام اخذ کرنے سے اختلافات اس وقت پیدا ہوا جب دین، اجتماعی نظام کی جگہ انفرادی چیز بن گیا۔ جب تک دین کا اجتماعی نظام قائم رہا اس وقت تک اُمّت میں اس باب میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں اُمّت کے افراد قرآن کے کسی حکم پر مختلف طریقوں سے عمل پیرا تھے؟ جب پھر کبھی اس قسم کا نظام قائم ہوگا تو تعبیرات کے اختلافات باقی نہیں رہیں گے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرآن کے الفاظ محفوظ رہتے۔ اگر قرآن کے الفاظ محفوظ نہ ہوتے اور مختلف فرقوں کے پاس احادیث کی طرح قرآن کے بھی الگ الگ مجموعے ہوتے تو اُمّت میں 'وحدتِ عمل' کا امکان ہی باقی نہ رہتا تاوقتیکہ کوئی دوسرا رسولؐ آکر وحی کے الفاظ کو محفوظ طور پر انسانوں تک پہنچا دیتا"۔

حقیقت یہ ہے کہ مودودی مرحوم طویل نویسی کے ماہر تھے اور الفاظ کو اس ترکیب سے سجاتے تھے کہ اصل مسئلہ، الفاظ کے انبار تلے دب کے رہ جاتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مودودی مرحوم نے آخر میں خود تسلیم کر لیا تھا کہ قرآن و سنت کی بنا پر پاکستان میں نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہی صورت اب بھی مسلسل جاری ہے۔

"موجودہ شریعت آرڈی ننس میں پھر کہا گیا ہے کہ شریعت سے مراد، اسلام کے وہ احکام ہیں جو قرآن پاک اور سنت میں مرقوم ہیں۔"

یاد رکھئے!

مملکتِ پاکستان میں دینِ اسلام رائج کرنا ناممکن ہے جب تک کہ قرآن اور سنت کی صحیح پوزیشن متعین نہ کی جائے اور صحیح پوزیشن حسب ذیل ہے:-

قرآن کریم ہمیں بنیادی قوانین اور مستقل اقدار مہیا کرتا ہے۔ ان قوانین کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانہ کے لوگ، باہمی مشاورت سے ایسے SUBSIDIARY قوانین وضع کرنے کے لئے آزاد ہیں، جو ان کے زمانہ کے حالات سے مطابقت رکھتے ہوں یہ 'SUBSIDIARY LAWS'

اسے پھر دہرائیے کہ میرا دوسرا سوال کیا تھا۔ اور اس کا جواب مودودی مرحوم نے کیا دیا تھا۔ میرا سوال یہ تھا کہ کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں سنّت رسول اللہ مرتّب شکل میں موجود ہو؟" مودودی مرحوم کا جواب تھا کہ اس کا (سنتِ رسول اللہ کا) کتاب کی شکل میں موجود ہونا ضروری نہیں۔ حضورؐ کی سنّت پر جو معاشرہ، اسلام کے پہلے دن قائم ہوا تھا۔ وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے۔ اب قارئین خود اندازہ لگائیں کہ وہ معاشرہ آج زندہ ہے یا نہیں اور اگر زندہ ہے تو کہاں؟

اب آیئے میرے تیسرے اور چوتھے سوال کی طرف! میرا تیسرا سوال یہ تھا کہ "کیا سنتِ رسولؐ کی اس کتاب کا متن" تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآن کریم کا متن اور چوتھا سوال یہ تھا کہ "اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے، اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائیگا کہ فلاں بات سنّت رسول اللہ ہے یا نہیں؟"

مودودی مرحوم نے اس کا جواب دیا تھا کہ "بلاشبہ سنّت کی تحقیق اور اس کے تعیّن میں بہت سے اختلافات ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایسے ہی بہت سے اختلافات، قرآن کے بہت سے احکام و ارشادات کے معنی متعیّن کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات اگر قرآن کو چھوڑ دینے کی دلیل نہیں بن سکتے تو سنّت کو چھوڑ دینے کے لیے انہیں دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے؟"

اس کے جواب میں، میں نے مودودی صاحب کو لکھا تھا۔ "اجی حضرت، متن اور اس کی تعبیرات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآن کے متن میں کسی ایک حرف کے متعلق بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ باقی رہیں اس کی تعبیرات، سو وہ انسانی فعل ہے جو کسی دوسرے کے لیے دین کی سند اور حجّت نہیں ہو سکتا! اس کے برعکس احادیث کی تعبیرات میں نہیں ان کے متن میں ہی اختلاف ہے۔ ایک فرقہ، ایک حدیث کو رسول اللہ کا قول مانتا ہے تو دوسرا اسکے قولِ رسولؐ ہونے سے یکسر انکار کرتا ہے۔

مودودی مرحوم نے لکھا تھا کہ سنّتوں کے متعلق اس قسم کے اختلافات سے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہیں آتی میں نے جواب دیا تھا کہ "اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے خدا کا کلام نہیں مانتا تو کیا اس سے اس کے ایمان پہ کوئی آنچ آئے گی یا نہیں۔ اگر آنچ آئے گی تو پھر قرآن اور حدیث کو یکساں وحی قرار دینا کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ کچھ سمجھا آپ نے کہ متن کے اختلاف اور تعبیرات کے اختلاف میں کتنا بڑا فرق ہے؟ لیکن آپ

اسے کیا سمجھیں گے جو قرآن کے متعلق کہہ رہے ہیں کہ "اگر احکام اخذ کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہو تو الفاظ میں اتفاق سے کیا فائدہ"؟ آپ کی اس بزالی منطق کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے (معاذ اللہ) قرآن کے الفاظ کو محفوظ رکھنے میں خواہ مخواہ اتنا اہتمام فرمایا۔ جب لوگوں نے اس سے مختلف تعبیرات لے لینی تھیں تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا کہ الفاظ محفوظ ہیں یا نہیں۔ جس شخص کا قرآن اور اس کی حفاظت کی غرض اور فائدہ کے متعلق یہ ایمان ہو، میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کس سطح پر گفتگو کیجائے؟ قرآن کے متن سے احکام اخذ کرنے سے اختلافات اس وقت پیدا ہوا جب دین، اجتماعی نظام کی جگہ انفرادی چیز بن گیا۔ جب تک دین کا اجتماعی نظام قائم رہا اس وقت تک امت میں اس باب میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں امت کے افراد قرآن کے کسی حکم پر مختلف طریقوں سے عمل پیرا تھے؟ جب پھر کبھی اس قسم کا نظام قائم ہوگا تو تعبیرات کے اختلافات باقی نہیں رہیں گے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرآن کے الفاظ محفوظ رہتے۔ اگر قرآن کے الفاظ محفوظ نہ ہوتے اور مختلف فرقوں کے پاس احادیث کی طرح قرآن کے بھی الگ الگ مجموعے ہوتے تو امت میں 'وحدتِ عمل' کا امکان ہی باقی نہ رہتا تاوقتیکہ کوئی دوسرا رسولؐ آکر وحی کے الفاظ کو محفوظ طور پر انسانوں تک پہنچا دیتا"۔

حقیقت یہ ہے کہ مودودی مرحوم طویل نویسی کے ماہر تھے اور الفاظ کو اس ترکیب سے سجاتے تھے کہ اصل مسئلہ، الفاظ کے انبار تلے دب کے رہ جاتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مودودی مرحوم نے آخر میں خود تسلیم کر لیا تھا کہ قرآن و سنت کی بنا پر پاکستان میں نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہی صورت اب بھی مسلسل جاری ہے۔

"موجودہ شریعت آرڈی ننس میں پھر کہا گیا ہے کہ شریعت سے مراد، اسلام کے وہ احکام ہیں جو قرآن پاک اور سنت میں مرقوم ہیں۔"

یاد رکھئے!

مملکتِ پاکستان میں دینِ اسلام رائج کرنا ناممکن ہے جب تک کہ قرآن اور سنت کی صحیح پوزیشن متعین نہ کی جائے اور صحیح پوزیشن حسب ذیل ہے:-

قرآن کریم ہمیں بنیادی قوانین اور مستقل اقدار مہیا کرتا ہے۔ ان قوانین کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانہ کے لوگ، باہمی مشاورت سے ایسے SUBSIDIARY قوانین وضع کرنے کے لئے آزاد ہیں، جو ان کے زمانہ کے حالات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ یہ 'SUBSIDIARY LAWS'

جن کو شریعت کہتے ہیں، وقت کے مطابق بدل سکتے ہیں۔ قرآن کے بنیادی اصول مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ ایک اسلامی مملکت کے سامنے جب کوئی معاملہ درپیش ہو تو اس کا لائحہ عمل حسب ذیل ہوگا:-

(۱) اس معاملے کے متعلق دیکھا جائے کہ حاکم اعلیٰ نے قرآن کریم کے اندر بنیادی اصول کیا دیا ہے!

(۲) زمانے اور مملکت کی ضروریات کو واضح طور پر متعین کیا جائے۔

(۳) فقہ اور احادیث کی کتابوں کے اندر، اس مسئلہ کی کوئی پہلی مثال پیش کی جائے۔ جو موجودہ مسئلہ کے متعلق ہو!

(۴) اگر یہ مثال موجودہ وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو، تو اسے براہ راست اختیار کر لیا جائے۔

(۵) اگر یہ مثال موجودہ وقت کے تقاضوں کے عین مطابق نہ ہو تو اسے مناسب ترمیم کے بعد عملی شکل دی جائے۔

(۶) اگر کوئی مکمل یا نامکمل مثال دستیاب نہ ہو تو موجودہ ضرورت کے مطابق قرآن کریم کے بنیادی نظریہ کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، نیا راستہ اختیار کر لیا جائے۔

یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس سے، مملکت پاکستان میں، ہر حکومت نے گریز کی راہ نکالی اور جس کے نتیجہ میں نامرادیوں اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہی اس مسئلے کا حل ہے لیکن اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ فقہ اور احادیث کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی قرآن کی طرح غیر متبدل اور اسی طرح دین کی بنیاد ہے جس طرح قرآن، تو کسی مملکت میں بھی نظام اسلام کا قیام قطعاً ممکن نہیں ہے۔

ہر مسلم فرقہ کے مطابق قرآن پاک اور سنّت کی تشریح و تعبیر ہوگی

اب شریعت آرڈی ننس کے ایک اور شاہکار کی طرف آیئے۔ قرآن و سنّت کے الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا ہے:-

"جیسا کہ دستور کے آرٹیکل (۱) ۲۲۷ میں مرقوم ہے کسی مسلم فرقہ کے کسی شخصی قانون کے ضمن میں شریعت کی تشریح اور تعبیر میں "قرآن پاک اور سنّت" کے الفاظ سے مراد، اس مسلم فرقہ کے مطابق قرآن پاک اور سنت کی تشریح و تعبیر ہوگی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے دستور کے مطابق، اس ملک میں ایک قوم نہیں بستی، یہاں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) اللہ کے قوانین کو حاصل نہیں ہوگا بلکہ ایسے قوانین کو حاصل ہوگا جو مختلف فرقہ بازوں کے خود تراشیدہ ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم معاشرہ کی بنیاد توحید پر رکھی تھی۔ اللہ ایک، اس کا قانون ایک، جو آخری رسول ؐ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملا تھا۔ اس کا نتیجہ وحدتِ اُمت تھی اور اُمتِ مسلمہ کی مشینری کے ہر جزو میں باہمی موافقت (COORDINATION) تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ "شرک" ہے۔ یعنی ایک خدائے واحد پر ایمان کی بجائے، مختلف خداؤں پر ایمان ہے۔ قرآن نے کہا تھا:-

... وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ۝ (۱۸ : ۱۱۰)

"اپنے پروردگار کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔"

پھر کہا:-

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ط إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝ (۳۱ : ۱۳)

"(اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا ہے) تم اس کے اقتدار میں کسی اور کو شریک نہ کرنا۔ بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔"

مختصر الفاظ میں:-

(i) یہ ایمان رکھنا کہ وہ اختیارات جو اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہیں، وہ کسی اور ہستی کو بھی حاصل ہو سکتے ہیں، شرک ہے۔

(ii) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور شخص یا طاقت کے سامنے جھکنا اور اس کے قوانین کا اتباع کرنا، شرک ہے۔

(iii) چنانچہ ایسے قوانین کا اتباع، جو قرآن کریم کے قوانین کے خلاف ہوں، شرک ہے۔

(iv) خدائے واحد کے قوانین کے اتباع کا لازمی نتیجہ وحدتِ اُمت ہے۔ اُمت کا فرقوں میں بٹ جانا شرک ہے کیونکہ ہر فرقے کے قریب، قوانین کے اتباع میں، آخری اتھارٹی، اللہ کے بجائے کوئی انسان ہوتا ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں، وہی حق و صداقت کا راستہ ہے، اس لئے کہ وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یاد رکھو! فرقہ پرستی اور گروہ بندی شرک ہے تم اس شرک کے مرتکب نہ ہو جانا (۴۲:۱۳؛ ۲۳:۵۳؛ ۳۰:۳۲، ۶:۱۶۰؛ ۳:۴)"۔

(ضمناً اس سے لفظ صلوٰۃ کا مفہوم بھی واضح ہو گیا یعنی ایسے معاشرہ کا قیام جس کی بنیاد قانونِ خداوندی کا اتباع ہو۔ ہمارے ملّا نے صلوٰۃ کے قیام کو صرف نماز پڑھنے تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نمازِ باجماعت بھی صلوٰۃ کا حصّہ ہے اور بڑا اہم حصّہ، لیکن صلوٰۃ کا مفہوم بڑا وسیع ہے)

یہ فرقہ بندی کیوں پیدا ہوتی ہے؟ عقل و شعور کے باوجود، یہ مذہبی رہنما، کیوں اُمّت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ :-

وَاٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۷﴾ (۴۵:۱۷)

"جو ضابطہ قوانین انہیں دیا گیا تھا وہ بڑا واضح تھا لیکن انہوں نے اس قسم کا علم (وحی) مل جانے کے بعد محض باہمی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے آپس میں اختلاف پیدا کر لئے۔ (یعنی ان کے اختلاف اور فرقہ بندی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ جو تعلیم انہیں وحی کے ذریعے دی گئی تھی، اس میں کچھ ابہام اور التباس تھا، وہ تو بڑی واضح تھی۔ یہ اختلاف، باہمی ضد اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے)۔ ان کے ان اختلافات کا فیصلہ دورِ قیامت میں ہو گا۔"

از روئے قرآن، اُمّتِ مسلمہ میں ہر قسم کی تفرق لعنت ہے۔ مذہبی فرقہ بندی تو صدیوں سے چلی آ رہی ہے، یہ اس وقت شروع ہوئی جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی اور قرآن کے احکام قوانین کے اتباع کی جگہ انسانوں کے خود تراشیدہ تصورات اور توہّمات نے لے لی۔ لیکن سیاسی پارٹی بازی، دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ اول الذکر بڑی لعنت ہے اور آخر الذکر نسبتاً چھوٹی۔ لیکن ہیں ہر دو ہی لعنت۔ یہ عجیب بات ہے کہ مرحوم صدر ضیاء الحق نے چھوٹی لعنت کو تو رد کر دیا، اس لئے کہ یہ اسلام کے منافی ہے لیکن اس کے ساتھ بڑی لعنت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسلام کے نام پر شعبدہ بازی کے خاطر اسے گلے سے لگائے رکھا۔ یہی صورتِ حال، پہلے بھی عرصہ ۴۰ سال سے جاری ہے۔

طریق انتخاب، جماعتی یا غیر جماعتی ؟

مرحوم صدر ضیاء الحق نے نومبر ۱۹۸۸ء میں انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں گے۔ اس کی دلیل جو اخبارات کے ذریعے سامنے آئی ہے یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں اور جماعت بندی، غیر اسلامی فعل ہے لیکن اکثر سیاسی پارٹیاں اور اخبارات اس کے خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی مرحوم صدر کے ساتھ کشمکش بھی جاری رہی۔ یہ لوگ جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے پُرزور مؤید ہیں کیونکہ اس کے بغیر ان کا قوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کا عمل قائم نہیں رہ سکتا۔ قوم میں تفرقہ اور ہنگامہ آرائی ان اخبار نویسوں کے لئے باعث برکت ہے۔ جماعتی انتخاب کے حق میں، ان کی دلیل یہ ہے کہ مملکت پاکستان، قائداعظمؒ کے متعین کردہ سیاسی، جمہوری اور جماعتی طریق انتخاب کے نتیجہ میں معرض وجود میں آئی، اس لئے اس عمل کو جاری رکھنا ضروری ہے۔ لیکن نہ معلوم یہ لوگ اس حقیقت کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ تحریک پاکستان نے متحدہ ہندوستان میں جنم لیا اور ایسے وقت میں جب انگریز کا سیکولر (SECULAR) نظام رائج تھا۔ اس وقت قائداعظمؒ نے جو راستہ اختیار کیا وہ آئینی تھا۔ قطعاً درست تھا، عقلمندی پر مبنی تھا اور مسلمان من حیث القوم ایک جماعت تھے، غیر مسلم (ہندوؤں وغیرہ) کے مقابلہ میں۔ ہندی مسلمانوں کی کشتی کو گرداب سے نکالنے کا یہی واحد راستہ تھا۔ لیکن مملکت پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد، یہاں کوئی دوسری غیر مسلم جماعت نہ رہی جو ان کے نفاذ اسلام کے راستہ میں اور مسلمانوں کی جماعت کے مقابلہ میں کھڑی ہو۔ اب وہ حالات جو متحدہ ہندوستان میں تھے، باقی نہ رہے۔ یہاں پر اب صرف مسلم قوم یا جماعت یا اُمت ہے۔ (قوم کے اندر تفریق کی اسلام اجازت نہیں دیتا)، لہٰذا یہ کہنا ہی غلط ہے کہ قائداعظم کا عمل پارٹی بازی کی سند ہے۔ متحدہ ہندوستان میں قائداعظمؒ اور مسلم قوم نظام اسلام پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اس وقت کے حالات کے مطابق پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کو منظم کر کے ایک سیاسی جماعت، بمقابلہ غیر مسلم اقوام، میں متشکل کیا۔ اور آئینی جنگ لڑ کر، جس کی بنیاد، مسلمانوں کو من حیث القوم الگ تشخص دلوانا تھا۔ مملکت حاصل کی۔

اب آپ کو دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

پہلی چیز یہ ہے کہ پاکستان میں مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کو نیست و نابود کر کے اسلام کا نظام نافذ کیا جائے۔

دوسری یہ کہ سیکولر نظام کو بحال رکھ کر مغربی جمہوریت کو بروئے کار لایا جائے اور اسلام کو، جیسا کہ

ہمارا مسلا چاہتا ہے، صرف نماز، روزے تک محدود کر دیا جائے۔
یہ آدھا تیتر، آدھا بٹیر والا نظام نہ صرف غلط ہے بلکہ قوم کے مستقبل کے لئے خطرناک ہے۔ گذشتہ ۴۰ برس میں اس نے جو بے یقینی، تذبذب اور بے راہ روی پیدا کی ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ جماعتی یا غیر جماعتی انتخابات کے حق میں جو مختلف دلائل اکثر دیئے جاتے ہیں، وہ بے معنی ہیں۔ اصل نقطہ جو فیصلہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ آیا پاکستان میں نظام مملکت اسلامی ہوگا یا سیکولر یعنی مغربی جمہوریت کا۔ اگر اسلامی نظام مقصود ہے تو انتخابات غیر جماعتی ہوں گے کیونکہ اسلام میں فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی اجازت نہیں اور اگر لوگ جماعتی نظام پر بضد ہیں تو پھر کھل کر سیکولر نظام کو اپنا لیا جائے اور اسلام کا نام لے کر مغربی جمہوریت کو بروئے کار لانے کی منافقت کو ختم کیا جائے۔
یہ ہیں پاکستان کے آئین میں بنیادی نقائص جو گذشتہ ۴۰ سال سے باوجود خواہش کے نفاذِ اسلام کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔
یہ مسئلہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کی توجہ کا مستحق ہے۔ اس کے بغیر، نفاذِ اسلام کا نام لے کر، محض وقت ضائع کرنا ہے۔

قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال

مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر، قرآنی آئین کے چند بنیادی نکات پھر مختصراً بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ **اسلامی مملکت کے امور میں، اقتدارِ اعلیٰ، صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے۔** مملکت کی مرکزی اتھارٹی، اللہ تعالیٰ کے احکامات و قوانین کو، جو قرآن کریم کے اندر موجود ہیں، نافذ کرنے کی مشینری ہوتی ہے۔ اسے خود تراشیدہ احکامات نافذ کرنے کا اختیار نہیں۔

۲۔ **مجلس آئین و قوانین ساز کے حدود:** قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ج ... (۶:۱۱۶)
"تیرے رب کی بات صدق و عدل سے مکمل ہو گئی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا" چنانچہ سربراہِ مملکت ہو یا پارلیمنٹ کا ادارہ، قرآنی احکام و اصولات میں نہ حک و اضافہ کر سکتا ہے۔ نہ ہی کسی قسم کی تبدیلی۔ پارلیمنٹ، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے مملکت کے لئے قانونی جزئیات اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق وضع کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی مملکت کی جمہوریت ("CONTROLLED DEMOCRACY") ہوگی اور اس پر کنٹرول خدا کی کتاب کا ہوگا۔

۳۔ **فیصلہ کن ادارہ** : اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ذیل میں ادارہ تحقیقات اسلامی محض "درشنی ہنڈیاں" ہیں۔ یہ حضرات، فقہ کی کتابوں کا ترجمہ تو کر سکتے ہیں، اسلامی آئین و قوانین مرتب نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم کو اساس تسلیم کر کے، اس کے مطابق، قوانین مرتب کرنا، ان کے بس کا روگ نہیں۔ وفاقی شرعی عدالت بھی، صلاحیت رکھنے کے باوجود، اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اسے اسلامی اور غیر اسلامی کے پرکھنے کا جو معیار دیا گیا ہے (یعنی کتاب و سنت) اس معیار کی کمزوری، سنت کا اختلاف ہے۔ صرف قرآن کو معیار مقرر کیجئے، پھر اختلاف باقی نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ (۴: ۸۲) اس کے تمام اصول، صاف اور واضح ہیں۔ چنانچہ اصل اصول یہ نہیں کہ کونسا ادارہ اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ قرآن خالص کو معیار قرار دے کر، جونسا ادارہ جی چاہے مقرر کر دیجئے، وہ متنازعہ امور کا فیصلہ نہایت آسانی سے کر سکے گا۔ واضح رہے کہ ہمارے اس اصرار کی وجہ یہ نہیں کہ ہمیں (معاذ اللہ) سنت رسول سے کوئی بیر ہے۔ سنت رسول سے بیر رکھنے والا تو مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔ ہمارے اصرار کی وجہ، عملی دشواری ہے۔ سنت ہر فرقہ کی الگ الگ ہے اس لئے سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ علاوہ ازیں، امت کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کی رو سے حتمی اور یقینی طور پر کہا جا سکے کہ فلاں بات، رسول اللہ کا ارشاد ہے یا نہیں۔ اس بنا پر معیار صرف قرآن قرار پا سکتا ہے جو بلاشبہ اللہ کا کلام ہے اور تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ البتہ اگر کسی نقطہ کی وضاحت مطلوب ہو تو اس کا صرف ایک حل ہے کہ عدالت عالیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اختلاف رکھنے والے، اپنی وکالت تو کر سکتے ہیں، جج کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔

۴۔ **نظام شوریٰ ئیت** : اسلامی مملکت کا نظام، شورائیت پر مبنی ہے، یعنی مملکت مشتمل ہوتی ہے پوری کی پوری امت پر اور اس کا کاروبار افراد ملت کے باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔ ... اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ... ۵ (۴۲: ۳۸) قرآن کا واضح ارشاد ہے۔ قرآن نے صرف اصول دیا ہے، اس کی عملی شکل کیا ہوگی اس کا تعین خود کرنا ہوگا۔

۵۔ **مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں**۔ قرآن کریم نے انسانوں کے اختلافات مٹانے کا ذریعہ "کتاب" قرار دیا ہے۔ اس کا عملی مفہوم کیا ہے؟ کتاب کے معنی ضابطہ قوانین کے ہیں۔ ایک ملک میں

بننے والے افراد ایک قوم اسی صورت میں بن سکتے ہیں جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کی اطاعت کریں۔ دوسرے الفاظ میں قوم کی وحدت کا انحصار قانون کی وحدت پر ہوتا ہے۔ اُمّت مسلمہ بھی، اُمّت واحدہ اسی صورت میں بن سکتی ہے کہ وہ ایک ضابطۂ قوانین کے تابع رہے۔ قرآن کریم میں نہ تو شخصی (PERSONAL) اور تمدنی (PUBLIC) قوانین (LAWS) کی تفریق کی گئی ہے اور نہ اس میں مختلف فرقوں کے لئے مختلف فقہوں کا تصور ہے۔ قرآن کریم کی نصِ صریح کی رُو سے فرقوں کا وجود شرک ہے (۳۰ : ۳۱) اور چونکہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت نہیں اس لئے جس طرح مذہبی فرقوں کا وجود از روئے قرآن شرک ہے۔ اسی طرح سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی خلافِ اسلام ہے۔ قرآن نے اسے سیاستِ فرعونی سے تعبیر کیا ہے (۴ : ۲۸)

۶۔ **تشکیلِ حکومت**: قرآن کریم حکومت کی شکل یعنی (FORM OF GOVERNMENT) سے بحث نہیں کرتا۔ وہ اسے اُمّت کی صوابدید پر چھوڑتا ہے کہ اپنے حالات کے مطابق جس قسم کی شکل بھی چاہیں، متعیّن کرلیں بشرطیکہ وہ مشاورت کے اصول اور قرآن کی بالادستی سے نہ ٹکرائے۔ اس ضمن میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت کی پارلیمنٹ میں "حزبِ اختلاف" (OPPOSITION PARTY) کا وجود نہیں ہوتا۔ غیر مسلم تو اسلامی پارلیمنٹ کے ممبر ہی نہیں ہو سکتے اور مسلمانوں کا دو ایسی پارٹیوں میں تقسیم ہو جانا، جن میں سے ہر ایک کا مقصد، دوسری پارٹی سے برسرِ پیکار رہنا ہو، اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ باہمی مشاورت میں اختلافِ رائے کا سوال دوسرا ہے۔ لیکن اُمّت کا مستقل طور پر دو گروہوں میں بٹ جانا سراسر غیر اسلامی ہے۔

۷۔ **اصولِ اہلیّت**: ذمہ داریاں سونپنے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے جو اصول مقرر کیا ہے وہ یہ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ...
(۴ : ۵۸)

"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو اختیارات تمہیں بطور امانت سپرد کئے گئے ہیں، انہیں ان کے سپرد کرو، جو اس کے اہل ہوں۔"

اس اہلیّت میں علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ، سیرت و کردار کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے۔ کیونکہ قرآن کی رُو سے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ... ○ (۴۹ : ۱۳)
"تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی

کی نگہداشت کرتا ہے "۔ جو لوگ قانونِ خداوندی سے غافل ہوں اور اپنے ہی خیالات و جذبات کے پیچھے لگ جائیں، ان کا حکم نہیں مانا جائے گا۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ (۱۸:۲۸)

"تم اس کی اطاعت مت کرو جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہو گیا اور اس نے اپنی خواہشات کا اتباع شروع کر دیا اور اس طرح اس کا معاملہ حد سے گزر گیا۔"

اب قارئین خود اندازہ لگالیں کہ پاکستان کے حکمرانوں میں یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آنے والوں میں کتنے ہیں جو قرآن کے مقرر کردہ اہلیت کے مطابق برسرِ اقتدار آئے۔ جس طریق سے انکی اکثریت برسرِ اقتدار آئی، وہ عیاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر کوئی نفاذِ اسلام کا نام لے کر قوم کو فریب دیتا رہا۔ حکمرانوں کے اسلام کا نام لینے کے باوجود قوم مسلسل استحصالی قوتوں کے جبر کے تلے پستی چلی جا رہی ہے۔ ہر جابر حکمران، بسم اللہ اسلام کے نام سے کرتا ہے اور پھر مسلسل اور پیہم اپنے خود تراشیدہ تصورات کے تحت قوم کو کچلتا چلا جاتا ہے۔

صدر ضیاء الحق مرحوم خلیق اور شفیق انسان تھے، مضبوط قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ ان کی فوجی حکمت عملی میں پختگی تھی۔ ذاتی طور پر بظاہر سچے مسلمان تھے۔ لیکن ان کی نظامِ اسلام کے قیام کی کوششیں ایک ناسمجھ بچے کی کوششوں جیسی تھیں۔

اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔

عبدالودود

EXCEPT SUBSCRIPTIONS FOR MONTHLY TOLUE-ISLAM ALL REMITTANCES

SHOULD BE SENT TO TOLU-E-ISLAM TRUST (REG.)

A/C NO. 4107-35 HABIB BANK LTD. MAIN MKT. BR. GULBERG, LAHORE.

محترمہ ثریا عندلیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لفظوں کا کھیل

ہمارے ہاں بہت سے کھیل مقبول ہیں، مثلاً کرکٹ، ہاکی، کبڈی، کشتی اور گالف، سکواش ٹینس وغیرہ۔ ان میں سے اوّل الذکر تو عوام کے لیے سمجھے جاتے ہیں جبکہ موخرالذکر کھیل خواص کے لیے مخصوص ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کھیلوں کی مقبولیت کے باوجود ہر شخص انہیں کھیلتا ہے نہ کھیل سکتا ہے۔ خواہ ان کے تعلق سے وہ کتنی بھی دلچسپی کیوں نہ رکھتا ہو۔ مگر ہم نے شاید کبھی غور نہیں کیا کہ ایک منفرد کھیل ایسا بھی ہے جو ہم سب بغیر کسی رکاوٹ اور دشواری کے ہر وقت کھیل سکتے ہیں اور کھیل رہے ہیں۔ اس کھیل کے لیے وقت یا مقام کی بھی کوئی قید نہیں۔ صبح سے لے کر رات تک کسی بھی جگہ کسی بھی حالت، کسی بھی کیفیت میں، خوشی ہو یا غم، مصیبت کا وقت ہو یا راحت کی گھڑی کام کر رہے ہوں یا بیکار بیٹھے تبادلۂ خیالات ہو رہا ہو ہم بغیر روک ٹوک کھیلتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں نہ کسی سامان کی ضرورت پڑتی ہے نہ کسی میدان کی، کھیل اتنا آسان کہ نہ صرف قوم کے بالغ و باشعور جوان، بوڑھے افراد اپنے اپنے طور پر اس میں منہمک ہیں۔ بلکہ ملکی اور قومی سطح پر یہ کھیل اس خوبی سے کھیلا جاتا ہے کہ اس کی شان ہی دوبالا ہو جاتی ہے — ریڈیو، ٹی وی جیسے مستحکم ذرائع ابلاغ اس کا کھلا ثبوت ہیں، جہاں بلا تامل یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اور ہم سب اسے بڑے اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ آنکھوں سے دیکھتے بھی ہیں اور کانوں سے سنتے بھی ہیں۔ یہ کھیل ہمیں اس طرح مست رکھتا ہے کہ ہم سوچنے سمجھنے کی صعوبت سے نجات پا لیتے ہیں۔ جو کچھ دیکھتے، جو کچھ سنتے ہیں، اسے سر جھکا کر قبول کر لیتے ہیں۔ یہ لفظوں کا کھیل ہے جو ہمارے درمیان جاری و ساری ہے۔ اس میں کھلاڑیوں کے لیے سچ کو پرکھنے کی صلاحیت چاہیئے ہوتی ہے نہ جھوٹ سے انکار کی ضرب لگانا پڑتی ہے۔ اس کھیل میں ایک دوسرے کے مخالف ٹیمیں نہیں بنتیں کیونکہ یہ آپس میں بھائی چارے کا کھیل ہے۔ یہ کھیل مل جل کر اور ایک دوسرے سے "ہم آہنگ" ہو کر کھیلا جاتا ہے۔ اس میں کسی ایک کی ہار یا دوسرے کی جیت نہیں ہوتی۔ بلکہ جھوٹ کی جیت ہوتی ہے۔ یہ کھیل جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کا کھیل ہے۔ اس کھیل کا اصول یہ ہے کہ اتنا جھوٹ بولو اور بولتے چلے جاؤ کہ

سُننے والے اسے سچ ماننے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ سچ ہی نظر آنے لگے۔ اس صورتِ حال کے بعد کسی اصلی سچ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہی اس کھیل کا مقصود ہے۔ یہی اس کی جیت ہے۔ اور یہی جن حیث القوم ہمارا شعارِ زندگی ہے جسے ہم نے صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ بن کر اختیار کر رکھا ہے۔ اور ہمیں صداقت و حقیقت کی روشنی کہیں نظر نہیں آتی۔

لفظوں کا کھیل، کھیل کر ہم نے انکی اس اہمیّت، عظمت اور حُرمت کو ہی ختم کر ڈالا جس کا براہ راست تعلّق خود ہماری زندگی سے تھا۔ ہاں مگر اس صورت میں کہ ہم نے ان کا صحیح استعمال کیا ہوتا۔ موقع محل کی مصلحت، کی خاطر نہیں بلکہ حقیقت کی بنیاد پر ان سے کام لیا ہوتا۔ لفظوں کی سچّائی کو برقرار رکھا ہوتا۔ اس طلسماتی کھیل میں گم ہو کر ہم یہ بھی بھول گئے کہ سچّے لفظوں میں تو وہ قوّت پوشیدہ ہوتی ہے جو دلوں کی دنیا میں انقلابِ عظیم بپا کر دیتی ہے اور اس کی شدّت سے ساری خود فریبیاں بھاپ کی طرح اُڑ جاتی ہیں۔ ان لفظوں کی پاکیزگی، سچّائی اور پختگی سے حیاتِ تازہ کی نمود ہوتی ہے۔

بلاشک وشبہ یہ لفظ نہ ہوں تو زندگی بے معنیٰ ہو جائے، گونگی بن جائے۔ معاشرہ میں حرکت ہو سکے نہ حرارت رہے۔ سب کچھ بے جان اور جامد ہو جائے۔ پھر ہم نے ایسی گراں بہا شے کو کھیل کیوں بنا ڈالا؟ کسی کو اسی کے مقام سے ہٹا کر پستیوں میں گرا دینا اور کسی کو اس کے مقام سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا دینا، یہ ہے وہ کرشمہ جو ہم لفظوں کو کھیل سمجھ کر یا لفظوں کا کھیل، کھیل کر مسلسل انجام دیئے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا انجام بھی ظاہر ہے۔ سارے ہی الفاظ اپنے معانی کھو بیٹھے ہیں۔ جب الفاظ کے اصل معانی باقی نہ رہیں تو عقائد و تصوّرات کا بدل جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیا یہ چھپی ہوئی بات ہے کہ دیانت، امانت صداقت اور شہادت جیسے عظیم اہم ترین اور انسانیّت ساز لفظوں کا استعمال اس اس طرح معنوی اور غیر حقیقی ہونے لگا ہے۔ اور ایسی بے جا اور غلط جگہ ان کا ٹھپّہ لگایا جاتا ہے کہ اپنا یہ حشر دیکھ کر قدیم اور جدید مستند لغات کے اوراق پھڑپھڑانے لگے ہیں۔ ان کے اندر درج الفاظ اپنا وجود یوں داغدار کیئے جانے پر شرمسار ہیں اور ندامت کے شدّتِ بوجھ سے سر نہیں اُٹھا سکتے۔ ان کی صداقت کو صریحاً منافقت بنا دیا گیا ہے اور ہمارا یہ کھیل جاری ہے۔ شائد اس لیئے کہ ہم بھی اتنی بڑی دنیا میں اپنا نام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی واہ واہ کروانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ تو کیوں نہ اسی کھیل کے ذریعے بڑی سہولت سے کھیلوں کی دنیا میں اوّل پوزیشن حاصل کر لیں۔ اس میں بھلا کون ہم سے بازی جیت سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اسی حوالے سے GUINESS BOOK OF RECORDS میں ہمارا نام بھی درج ہو جائے، بس پھر اور کیا چاہیئے۔

لفظوں کے اس کھیل سے جھوٹی تعریف، مبالغہ آرائی، چاپلوسی اور خوشامد ایسی "صفاتِ خصوصی" انسان کی ذات کو گھیرتی اور نشوونما پاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان "صفات" کی موجودگی سے افرادِ قوم لفظوں کے کھیل کی طرف لپکتے ہیں (چونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیئے لازم و ملزوم ہیں اس لیئے جس طرح بھی کہا جائے کوئی فرق نہیں پڑتا) پھر اس کھیل سے ان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور ان سب کو ہوا دینے والا اس دَور کا مؤثر ترین ہتھیار پروپیگنڈا ہے۔ جس سے عوام کے دل و دماغ اس طرح مفلوج ہو جاتے ہیں کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ سچّائی اور جھوٹ میں تمیز کیسے کر سکتے ہیں؟ جب کہ پروپیگنڈا کی ظالمانہ طاقت سچائی کا گلا ہی گھونٹ ڈالتی ہے۔ اور جان تو سب کو عزیز ٹھہری، کون سچائی کے لیے مدافعت کی آگ میں کودے؟ کیا ہمارے ہاں ایسا نہیں ہو رہا؟ سچ کہا آپ نے! یہ سب کچھ ہوتا رہے ہم تو یونہی زندگی گزارتے چلے جائینگے۔

اسلامی نظام کے قیام کے لیئے ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ لیکن اسلام کے **ماخذ** اللہ کی کتاب مبین "قرآنِ کریم" کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی کہ وہی اس نظامِ خداوندی کی مہیمن ہے۔ مگر اس طرف نگاہ جائے بھی کیسے، جب لفظوں کے کھیل سے یہ عقیدہ نہ صرف وضع ہو چکا ہو بلکہ دلوں کے اندر راسخ کر دیا گیا ہو کہ قرآن کے الفاظ پڑھ لینے سے (جسے عرفِ عام میں تلاوت کہا جاتا ہے، حالانکہ تلاوت کے معنی پیروی کرنے کے ہوتے ہیں) ڈھیروں ثواب ملتا ہے اور پڑھنے والے کی سیٹ جنّت میں بُک (Book) ہو جاتی ہے۔

قول و فعل کا تضاد اس کھیل کا نمایاں پہلو ہے۔ جس کے نتیجے میں معاشرے میں طبقات در طبقات پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن جب انہی لفظوں کے کھیل سے امیری غریبی کا جواز قائم کر لیا گیا۔ تو پھر طبقات سے نجات کا کیا سوال؟ جب خیرات کو کارِ صد ہزار ثواب سمجھ لیا گیا تو پھر گداگروں و محتاجوں کے دستِ سوال دراز کرنے پر اعتراض کیوں؟ جب شہادت کو من مانے معنی پہنا دیئے گئے تو پھر کیسے نہ ہر مرنے والا شہید کہلائے؟ سوچیئے! کیا واقعی لفظوں کے کھیل نے ہماری زندگی اتنی آسان بنا دی ہے کہ کیجئے کرائیے کچھ نہیں بس یہ کھیل کھیلیئے اور مراتب و درجات حاصل کر لیجئے۔ اور یہ بھی کہ اس کھیل نے ہمارے تمام عیوب و جرائم پر اس طرح پردہ ڈال رکھا ہے کہ ہماری دانست میں (معاذ اللہ) انہیں خدا بھی نہیں دیکھ سکتا، اس لیئے ہم سیدھے سیدھے جنّت میں پہنچا دیئے جائینگے۔

یہ لفظوں کا کھیل ہی تو ہے، جس نے مکافاتِ عمل کے ازلی و ابدی قانونِ خداوندی کی کاٹ ہمارے وضعی تصوّرِ بخشش سے کر رکھی ہے۔ یہ وہ بخشش ہے۔ جسکے سامنے سب اچھے بُرے عمل ایک ہو جاتے

ہیں۔ یہ تو ایسی بخشش ہے جو تمام غلط کاریوں اور جرائم کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اور ہمیں مزید جرم و گناہ کرنیکا لائسنس مل جاتا ہے۔ اور اللہ تبارک تعالیٰ نے جزا اور سزا کا جو قانون بنا رکھا ہے اس پکے حیلے سے وہ بے چارہ منہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اپنے وجود کے کتنے ہی عبرت ناک انجام کے ساتھ ہماری اس زندگی کا اختتام کیوں نہ ہو، اس تصورِ بخشش کے طفیل ہمارے جذباتی اور مقدس الفاظ اس کی سپر بن جاتے ہیں۔ یوں لفظوں کے اس حسین و رنگین کھیل کی بدولت ہماری حسناتِ مستور، اور ناکردہ کارہائے عظیم کی دھوم مچ جاتی ہے۔ معاشرہ بے اختیار اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا پکار اٹھتا ہے۔

محض لفظوں کا کھیل کھیلتے رہنے سے جب اتنی عزت و شہرت ہم پر صدقے قربان ہونے لگے تو آپ ہی بتائیے! ہم میں سے کون عقل کا کورا ایسا ہوگا جو اس ہاتھ آئی دولت سے محروم رہنا پسند کریگا۔

تعزیت

۱۔ بزمِ طلوعِ اسلام چشتیاں کے سابق نمائندہ محترم چوہدری سلطان احمد صاحب ۵ ستمبر ۱۹۸۸ء کو نشتر ہسپتال ملتان میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم اللہ کی کتاب قرآن کریم اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے۔ انہوں نے چشتیاں میں سرسید پبلک ہائی سکول کا اجرا کیا۔ ان کی جدائی تادیر محسوس کی جاتی رہے گی۔

دُعا ہے کہ ان کے صاحبزادگان فاروق سلطان اور شاہد سلطان کو اللہ تعالیٰ ہمت و توفیق عطا فرمائیں کہ وہ اپنے والدِ محترم کی روشن کی ہوئی قرآنی شمع کو تابندہ و پائندہ رکھیں۔ اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں۔

۲۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کے دیرینہ رفیق اور بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے رکن محترم ملک محمد شریف صاحب ۱۱ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ایک حادثہ میں وفات پا گئے۔ مرحوم ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور تحریکِ طلوعِ اسلام کا ایک قابلِ قدر سرمایہ۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دیں اور پس ماندگان اور اراکینِ بزم کو صبرِ جمیل عطا فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارمغان ثاقب
لاہور۔

ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

کیا وہ اس صدی کی نابغۂ روزگار شخصیت تھے؟

۲۲ ستمبر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا یوم وفات ہے۔ اس موقع پر ان کے پیروکاروں کی جانب سے، مختلف اردو اخبارات میں مضامین شائع کرائے گئے، جن میں انہیں اس صدی کی نابغۂ روزگار شخصیت ثابت کیا گیا ہے۔ اس بارے میں اردو اخبارات کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ انہوں نے اپنے اخبارات کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں جو رطب و یابس ملے، شائع کر دیتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ملک کے انگریزی اخبارات ایسا نہیں کرتے، اس لئے کسی انگریزی اخبار میں ایسا کوئی مضمون شائع نہیں ہو سکا۔ اردو اخبارات میں ان کے بارے میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں، ان کے پیروکاروں کی جانب سے دعوے کیا گیا ہے:۔

"مولانا مودودی کو لوگ (مراد جماعت اسلامی کے لوگ) اس صدی کا سب سے بڑا انسان کہتے ہیں، یہ مبالغہ آرائی نہیں۔ یہ صدی برسہا برس کی غلامی، فکری و عملی انحطاط کے بعد مسلمانوں کی بیداری کی صدی ہے، ہر جگہ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں۔ اس صدی کے اپنے مسائل ہیں، اپنے حالات ہیں۔ ایسے میں اسلام کی جاندار ترجمانی کا فرض ادا کرنے والے پوری دنیا میں، دو چار ہی ہوں گے، انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ انہی نابغۂ روزگار شخصیات میں سے مولانا مودودی بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اس صدی کا سب سے بڑا انسان کہا جاتا ہے۔"

(روزنامہ جنگ کراچی بابت ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء)

دوسرے مضامین میں، انہیں اس زمانہ میں اسلام کے فہم کی سب سے بڑی اتھارٹی قرار دیا گیا ہے۔

آئندہ سطور میں چند اہم مسائل کے حوالے سے ہم ان کی اسلام فہمی کا جائزہ لیتے ہیں، ان میں سب سے اہم مسئلہ انسانی خلافت کا ہے۔ خلیفہ کے بارے میں مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن کی پہلی جلد میں فرماتے ہیں:۔

انسان بطور خلیفۃ اللہ

"اس فقرہ میں تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ تمام انسان، زمین میں خدا کے خلیفہ ہیں، اس معنی میں کہ خدا نے اپنی مملوکات میں سے بہت سی چیزیں ان کی امانت میں دی ہیں اور ان پر تصرف کے اختیارات بخشے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان خلیفوں میں مراتب کا فرق بھی خدا ہی نے رکھا ہے۔ کسی کی امانت کا دائرہ وسیع ہے اور کسی کا محدود۔ کسی کو زیادہ چیزوں پر تصرف کے اختیارات دیئے ہیں اور کسی کو کم چیزوں پر۔ کسی کو زیادہ قوتِ کارکردگی دی ہے اور کسی کو کم اور بعض انسان بھی بعض انسانوں کی امانت میں ہیں۔

تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے۔ پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے اور جس کو جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے، اسی میں اس کا امتحان ہے۔ کہ اس نے کہاں تک خدا کی امانت میں تصرف کیا۔ کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا اور کس حد تک اپنی قابلیت اور ناقابلیت کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجے پر، زندگی کے دوسرے مرحلے پر، انسان کے درجے کا تعین منحصر ہے۔"

(تفہیم القرآن جلد اول صفحات ۶۰۶، ۶۰۷ (اس جلد کی آخری سطریں ہیں)

یہ تو تھی مودودی صاحب کی تحقیق کہ انسان، اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اسی کے مطابق اس نے اپنی کارکردگی دکھانی ہے، لیکن علمائے اسلام کا اس بارے میں کیا خیال ہے، اسے علامہ الماوردی ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

"وَامْتَنَعَ جمھور العلماء مِن جواز ذالِكَ وَنَسَبُوْا قَائِلَهٗ اِلَی الفجور۔ وقالوا یَسْتَخْلِفُ مَنْ یغیبُ اَوْ یموتُ۔ واللہ لا یغیبُ ولا یموتُ۔ وقد قیل لابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہٗ یا خلیفۃَ اللہِ فقال لَسْتُ بخلیفۃِ اللہِ ولکنّی خلیفۃُ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم"۔ (الاحکام السلطانیہ از الماوردی صفحہ ۱۵)

(ترجمہ) جمہور علمائے اسلام نے انسان کے خدا کا خلیفہ ہونے کا انکار کیا ہے اور جو اس قسم کا عقیدہ رکھے، اسے فاسق و فاجر قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خلیفہ تو اس کا ہوتا ہے جو غائب ہو جائے یا مر جائے جبکہ اللہ تعالیٰ نہ غائب ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں موت آتی ہے۔ اس لئے جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اللہ کا خلیفہ کہہ کر پکارا گیا تو انہوں نے اس کی فوراً تردید کی اور فرمایا کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔

امام ابن تیمیہ نے اس بارے میں جمہور علماء سے بھی زیادہ سخت رویہ اختیار کیا۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ غلط عقیدہ اسلامی تعلیمات میں ابن العربی نے داخل کیا تھا، پھر اسے خلاف اسلام ثابت کرتے

ہوئے اپنے فتوے کے آخر میں فرماتے ہیں:۔

"فَمَنْ جَعَلَ لَهُ خَلِيفَةً فَهُوَ مُشْرِكٌ بِهِ"

(ترجمہ) جس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بنایا، تو وہ خالص مُشرک ہے۔

(الفتاوی الکبریٰ، طبع بیروت جلد دوم صفحہ ۵۵۳)

ملاحظہ ہو، مودودی صاحب ایک عام انسان کو خدا کا خلیفہ بنانے پر اصرار کرتے ہیں جبکہ امام ابن تیمہ نبی تک کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بنانے کو شرک قرار دیتے ہیں، خیال رہے کہ اسلام میں شرک، کفر سے بڑا گناہ ہے۔ اور اس گناہِ کبیرہ کو مودودی صاحب علمی تحقیق کے رُوپ میں اسلام کی بنیادی تعلیم قرار دیتے ہیں اور ان کے پیروکار انہیں اس صدی کی نابغۂ روزگار شخصیت قرار دیتے ہیں۔ کیا کفر و شرک کو اسلام قرار دینے والی شخصیات نابغۂ روزگار ہوا کرتی ہیں؟ اور آگے چلیے:۔

شیطان کے شاگرد

مودودی صاحب کے پیروکار انہیں اس صدی کا سب سے بڑا انسان ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ اپنے سے مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں پر فتوے لگانے میں نیم تعلیم یافتہ مولوی حضرات کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں، پھر ان کا مبلغِ علم چونکہ بہت ہی محدود ہے، اس لئے ان کے ایسے زہریلے فتاوی کی زد بعض اوقات سلف صالحین تک جا پڑتی ہے۔ اسی تفسیر جلد اوّل میں سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۱۹ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اس جگہ جس ردّ و بدل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے، جس کے لئے خدا نے اسے پیدا نہیں کیا ہے اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے، جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہ تمام افعال، جو انسان اپنی اور اشیاء کی فطرت کے خلاف کرتا ہے اور وہ تمام صورتیں، جو وہ منشائے فطرت سے گریز کے لئے اختیار کرتا ہے، اس آیت کی رُو سے شیطان کی گمراہ کن تحریکات کا نتیجہ ہیں، مثلاً عملِ قومِ لوط، ضبطِ ولادت، رہبانیت برہمچرج، مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا، مردوں کو خواجہ سرا بنانا، عورتوں کو ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سپرد کی ہیں اور انہیں تمدن کے اُن شعبوں میں گھسیٹ لانا، جن کے لئے مرد کو پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے بے شمار افعال جو شیطان کے شاگرد، دنیا میں کر رہے ہیں، دراصل یہ معنی رکھتے ہیں کہ یہ لوگ خالقِ کائنات کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کو غلط سمجھتے ہیں اور ان میں اصلاح فرمانا چاہتے ہیں۔" (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۹۹ انیسواں ایڈیشن)

دیکھئے اپنے زورِ قلم میں مودودی صاحب اُمّت کی کن ہستیوں کو شیطان کے شاگرد قرار دے گئے ہیں۔ امام ابن قیمؒ کا دعوےٰ ہے کہ احادیثِ نبوی سے ضبطِ ولادت کا جواز ثابت ہے اور صحابہ کرامؓ کی اکثریت اس کے جواز کی قائل تھی۔ (زاد المعاد جلد چہارم صفحہ ۲۰)

انہی احادیث کی روشنی میں اسلامی فقہ کے چاروں ائمہ یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل نے ضبطِ ولادت کو جائز قرار دیا ہے۔ (مختصر الفتاوی المصریہ از امام ابن تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۴۳)

اور یہی جمہور علماء اسلام کا متّفقہ مسلک ہے۔ (زاد المعاد جلد چہارم صفحہ ۲۰)

دیکھئے اس صدی کا سب سے بڑا انسان، اُمّتِ مسلمہ کی کن کن برگزیدہ ہستیوں کو شیطان کا شاگرد قرار دیتا ہے۔

ہاروت و ماروت کا قصّہ

سورۃ البقرہ میں ہاروت و ماروت کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تفسیر مودودی صاحب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"اس کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم، بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں، ان کی آزمائش کے لئے بھیجا ہوگا۔ جس طرح قومِ لوط کے پاس فرشتے، خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے پاس، وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ سامری میں اپنی دوکان لگائی ہو گی اور دوسری طرف وہ اتمامِ حجّت کے لئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہاری آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تو اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود، لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو، وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں، اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی، ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے، انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا، جو بجائے خود بُری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خور حاکم کو نشان زدہ سکّے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جرم

میں پکڑ لیں، اور اس کے لئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہے۔"

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۹۸)

مودودی صاحب اپنی اس خود ساختہ تفسیر میں فرما رہے ہیں کہ فرشتے جب اور جہاں جی چاہے، انسانی شکل اختیار کر کے، لوگوں کے سامنے آ سکتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم میں ان ملائکہ کے متعلق جو میدانِ جہاد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعتِ مومنین کی مدد کے لئے نازل ہوئے تھے، یہ ارشادِ ربانی ہے کہ — لَمْ تَرَوْهَا (۹/۲۶) تم انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ تو فرشتوں کے متعلق یہ فرماتے ہیں اور مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ جب جی چاہے انسانی شکل میں سامنے آ سکتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ فرشتے قومِ لوط کے پاس انسانی شکل میں آئے تھے۔

شریعتِ اسلامی میں جھوٹ بولنے کی اجازت

۱۹۵۸ء میں جماعتِ اسلامی کے بعض نہایت ہی سربرآوردہ حضرات، جماعتِ اسلامی چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کا ایک الزام یہ تھا کہ مودودی صاحب بعض اوقات نہ صرف یہ کہ اپنے قائم کردہ اصول توڑ دیتے ہیں بلکہ اس مقصد کے لئے جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا (توبہ پناہ بخدا) کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ جہاں تک جھوٹ بولنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں فرمایا

"راست بازی اور صداقت شعاری، اسلام کے اہم ترین اصولوں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے، لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں، جن کی خاطر نہ صرف جھوٹ بولنے کی اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے اور اس اصول کے بعد فرمایا کہ اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں، کعب بن اشرف کے قتل کے لئے جب محمد بن مسلمہ کو، حضورؐ نے مامور کیا، تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں، حضورؐ نے بالفاظِ صریح انہیں اجازت دے دی۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۸ء صفحہ ۵۴۵)

رسول اللہ صلعم پر اصول شکنی کا الزام

مودودی صاحب پر دوسرا الزام یہ تھا کہ انہوں نے جماعت کی تاسیس کے وقت جن اسلامی اصولوں کا اعلان کیا تھا، بعد میں ایک ایک کر کے ان کی مٹی پلید کرتے گئے۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ (نعوذ باللہ) خود رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا تھا۔ ان کے الفاظ ہیں:-

"اسلامی نظام کے اصولوں میں ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے،

اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سواء فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے منصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپؐ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش، امام قریش سے ہوں گے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔"

(رسائل ومسائل، حصہ چہارم ص ۳۳۰-۳۲۹)

ان دو اقتباسات پر غور کیجئے۔ اور پھر سوچئے کہ اس صدی کے اس سب سے بڑے انسان کی یہ اسلامی تحقیق پڑھنے کے بعد موجودہ دور کے تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وکردار کے متعلق کس قسم کا تصور ابھرے گا۔

سرمایہ داری نظام کی علمبرداری

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم ایک ایسے مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں، جس کا اس ملک کے کروڑوں انسانوں سے تعلق ہے اور مودودی صاحب اس کے بارے میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے ہیں کبھی وہ اس معاملے کو حلال قرار دیتے اور کبھی حرام، جیسے حلال وحرام، شریعتِ اسلامی کے احکامات نہیں، بلکہ بچوں کا کھیل ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں 'مولانا' نے زمینداری نظام کو جائز ثابت کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام تھا مسئلہ ملکیت زمین، اس میں زمین کی لامحدود ملکیت کو جائز قرار دینے کے لئے انہوں نے یہ استدلال کیا تھا۔

"اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے، جائز راستے سے آئے، جائز طریقے پر خرچ ہو، جائز راستوں پر جائے، اور خدا اور بندوں کے جو حقوق، اس پر عائد کئے گئے ہیں۔ وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ، اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو اسی طرح وہ ہم سے بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔"

(مسئلہ ملکیت زمین شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی لاہور[۱] ص ۱۰۹)

---

[۱] اس کتاب کو میانوالی اور ساہیوال کے دو بڑے زمینداروں نے اپنے خرچ پر شائع کر کے تقسیم کیا تھا۔"

اگر واقعی یہ اسلام کا حکم تھا تو پھر اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن ۱۹۷۷ء میں جب جماعتِ اسلامی قومی اتحاد میں شامل ہوئی اور اس نے اپنا یہ منشور مرتب کیا کہ غیر حاضر زمینداری کا نظام شریعتِ اسلام کے خلاف ہے تو مودودی صاحب نے اس پر بھی دستخط کر دیئے اور اعلان فرمایا کہ شریعتِ اسلامی میں زمین اس کا حق ہے، جو اس پر ہل چلائے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان کی جماعت کے کسی عالمِ دین یا کارکن نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ آپ پچیس سال تک جس معاملے کو خالص اسلامی قرار دیتے رہے ہیں وہ اب یکایک کیسے غیر اسلامی ہو گیا۔ اگر جماعت میں ایسے صاحبِ فہم لوگ ہوتے تو آج وہ انہیں اس صدی کا سب سے بڑا انسان کبھی نہ کہتے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق و عبر

۱۔ یورپ میں اسلام کی تبلیغ۔

ہمارے ملک سے ہر فرقے کے علماء بڑی تعداد میں اسلام کی تبلیغ کے لئے یورپ کے مختلف ممالک آجا رہے ہیں۔ وہ وہاں یہ تبلیغ کس انداز میں کرتے ہیں، اس کی ایک جھلک پروفیسر ڈاکٹر سید صدیق حسین صاحب نے روزنامہ نوائے وقت کی ۲۱ جون ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں دکھائی ہے، قارئین طلوعِ اسلام بھی اسے ملاحظہ کرلیں:۔

"یہ مغربی یورپ کے ایک نہایت متمول اول درجہ کے ملک کا خوبصورت دارالخلافہ ہے۔ پاکستان سمیت بیرونی ممالک سے آکر یہاں بسنے والے مسلمانوں نے اپنے وسائل اکٹھے کر کے ایک بہت دلکش مقام پر ایک شاندار مسجد تعمیر کی ہوئی ہے۔ اور اس میں ایک جامع لائبریری بھی ہے۔ یہاں پنجگانہ نماز باقاعدہ ادا کی جاتی ہے۔ اور نمازِ جمعہ، عیدین اور دیگر دینی تقاریب پُروقار طریقے سے ادا کی جاتی ہیں۔ اور سب مسلمان امن و سکون سے بس رہے ہیں پھر ایک دن کوئی شخص اعلان کرتا ہے کہ پاکستان سے ایک بہت بڑے مولانا صاحب تشریف لا رہے ہیں، جو نماز بھی پڑھائیں گے۔ اور بعد میں وعظ بھی دیں گے۔

بعض لوگ مولانا صاحب کے استقبال کے لئے ہوائی اڈہ پر پہنچتے ہیں۔ اور انہیں ہاروں سے لاد دیتے ہیں۔ اور پھر میزبان کی چمکدار لموزین کار میں بیٹھ کر مولانا صاحب مسجد میں تشریف لاتے ہیں۔ لیکن ہوائی جہاز چند منٹ لیٹ پہنچا تھا، اسلئے نماز کا مقررہ وقت ہو جانے پر جماعت نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اب عین اُسی وقت مولانا صاحب بھی تشریف لے آتے ہیں۔ اور ہاروں سے لدے پھندے آخری صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

نماز ختم ہونے پر امام منبر کو خالی کر دیتا ہے۔ اور مولانا صاحب کو پُرجوش دعوت دی جاتی ہے کہ وہ تشریف لائیں۔ اور حاضرین کو خطاب کریں لیکن مولانا کا چہرہ کچھ سنجیدہ بلکہ رنجیدہ

نظر آتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد وہ منتظر حاضرین کو ان الفاظ سے خطاب کرتے ہیں "جنہیں نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ نہیں آتا اور پھر اپنی انگلی سے نشاندہی کرتے ہوئے: وہ شخص وہاں۔ اور یہ بوڑھا یہاں۔ ان کے نماز ادا کرنے کا طریقہ ان کے مشکوک عقیدہ کی غمازی کرتا ہے۔ یہ ہمارے پیارے مذہب سے باہر ہیں۔ ان شیطانی الحاد پسندوں کو فوراً باہر نکال دیا جائے، پیشتر اس کے کہ یہ اپنی روحانی آلودگی کے جراثیم دوسروں میں بھی منتقل کر دیں" پھر مجمع سے ایک بلند آواز "آپ کو یہ کہنے کی جرات کیسے ہوئی" ایک آواز "تمہیں اس ملحدانہ طریقہ سے نماز پڑھنے کی جرأت کیسے ہوئی" اور پھر اس اچھی بھلی پرسکون مسجد نے ایک مچھلی مارکیٹ کا منظر پیش کیا۔

اور مسجد میں عام کھلم کھلا لڑائی شروع ہو گئی چیخیں، گالیاں۔ ایک نوجوان نے جس کے بوڑھے باپ کو داڑھی سے پکڑ کر مسجد سے باہر گھسیٹا جا رہا تھا، ریوالور نکال لیا۔ اور پہلے ڈرانے کے لئے کچھ ہوائی فائر کئے۔ اور اس کے بعد اپنے باپ کو گھسیٹنے والوں پر ایک برسٹ مارا۔ مسجد کے فرش پر جا بجا خون کے دھبے پڑ گئے۔ الغرض مسجد ایک باقاعدہ میدانِ جنگ میں تبدیل ہو گئی۔

اس سے پیشتر کہ زیادہ خون خرابہ ہوتا، پولیس کی ایک پارٹی سدھائے ہوئے کتوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گئی۔ لیکن اس سے ذرا پہلے، ہاروں سے لدے پھندے مولانا میزبان کی "ملوزین کار" میں مسجد کے چور دروازے سے فرار ہو چکے تھے۔

ڈرامے کا ڈراپ سین۔ دو شخص ہلاک۔ دو درجن جن میں دو بچے بھی شامل تھے، شدید زخمی۔ ایک نزدیک کے ہسپتال کے شعبہ حادثات میں گیارہ زخمی داخل۔ پولیس نے تیس افراد گرفتار کئے۔ سوائے مولانا صاحب کے جو بر وقت فرار ہو چکے تھے اور مزید نقصِ امن کے خطرہ کے پیش نظر پولیس نے خون آلود مسجد کو خالی کرایا۔ تالا لگایا اور سر بمہر کر دیا۔

اور پھر مولانا صاحب چند دن کی سیر اور تفریح کے بعد پھر وطن واپس تشریف لے آئے جہاں کراچی ائرپورٹ پر ان کا شاندار استقبال ہوا۔ اور ان کو ہاروں سے لاد دیا گیا۔ اور یہ متحارب فریق، شیعہ، سنی۔ یا اہل حدیث نہیں بلکہ ایک ہی فقہ حنفی یا مقلدین کے دو ذیلی گروہ۔ دیوبندی اور بریلوی تھے"۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور بابت ۱۲ جون ۱۹۸۸ء)

۲۔ علامہ طاہر القادری صاحب کی قرآن فہمی۔

حال ہی میں، قرآن مجید کی عظمت پر تقریر کرتے ہوئے، ادارہ منہاج القرآن کے سرپرست جناب علامہ طاہر القادری صاحب نے فرمایا تھا کہ "قرآن کی عظمت و بزرگی اور رفعت و سطوت نے ظاہراً نزدیک ہوتے ہوئے بھی، اسے فہم انسانی سے دُور بنا دیا ہے"۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان قرآن مجید پڑھ کر سمجھ نہیں سکتا۔ اس لئے اسے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ علامہ صاحب کی اس نادر قرآن فہمی پر تبصرہ کرتے ہوئے، ایڈیٹر ماہنامہ طبِ صحت لکھتے ہیں۔

"اس فقرہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ قرآن اگرچہ حسی طور پر ہمارے پاس ہے تاہم وہ اس قدر ارفع و بلند مرتبہ کتاب ہے کہ انسانی ذہن اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں تمام عقائد و عبادات، علوم، ہدایات، اصولِ دین اور فلاحِ دارین سے متعلق ضروری امور کا نہایت مکمل، واضح اور کمال کو پہنچا ہوا بیان ہے۔ انہیں بڑے سادہ اور عام فہم طریق سے ذکر کیا گیا ہے کہ معمولی اور سادہ الذہن قاری بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

متعدد قرآنی دعاوی ہمارے نظریہ کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن واضح کتاب ہے (سورۃ یوسف آیت اوّل)، ہر چیز کا کھلا ہوا بیان ہے (نحل: ۸۹) کتبِ سابقہ کی تفصیل ہے (یونس: ۳۷) ایک حکمت والے خبردار نے اس کتاب کو جانچ لیا ہے اور اس کی باتوں کو کھول کر بیان کیا ہے (ہود: ۱) قرآن سب قوموں کے لئے نصیحت ہے (یوسف: ۱۰۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ خدا تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو قرآن سے نصیحت کریں (ق: آخر)

اگر قرآنِ مجید فہم انسانی سے دُور ہے تو ان فرامینِ خداوندی کی حیثیت کیا ہے؟ جو سمجھی نہیں جا سکتی وہ کتاب واضح کیا ہوئی۔ نیز اس نے کتبِ سابقہ کی تفصیل کیا بتانی ہے؟ اس کا ہر چیز کو کھول کر بتانے کا مطلب کیا رہ گیا؟ اگر یہ کتاب انسانی فہم سے بلند تر ہے تو حکمت والی خبردار ہستی کی طرف سے اس کی پرکھ پڑتال اور باتیں کھول کر کرنے کا مفہوم کیا ہے؟ اگر یہ کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آئی تو اس نصیحت کا فائدہ اور مطلب کیا؟ اندریں حالات خدا تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو قرآن سے نصیحت کرنے کا کیا مقام رہ جاتا ہے؟

(ماہنامہ طبِ صحت لاہور بابت اپریل ۱۹۸۸ء صفحہ ۷)

۳۔ صدر جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت پر امیر جماعتِ اسلامی کا تبصرہ!

جماعتِ اسلامی پاکستان نے، قومی انتخابات کے لئے اپنی انتخابی مہم کا آغاز ۱۵ جولائی ۱۹۸۸ء کو کراچی میں ایک جلسہ عام سے کیا۔ اس میں امیر جماعتِ اسلامی نے صدر جنرل ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دورِ حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"چالیس سال کے دوران میں حکمرانوں نے تعصبات اور نفرتوں کو پروان چڑھایا، خصوصاً گذشتہ گیارہ سال کے دوران امن و امان کو تباہ کیا گیا۔ قومی یکجہتی کو منتشر کیا گیا طلبہ پر ظلم کیا گیا۔ ان کا یونین سازی کا حق چھینا گیا، مزدوروں پر پابندی لگائی گئی، اس ۱۱ سالہ دور میں فوج کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا گیا۔ فوج کے جوان ہمارے لئے باعثِ عزت ہیں ہم ان سپاہیوں کو سلام کرتے ہیں۔

یہ سرحد پر ملک کا دفاع کرتے ہیں۔ لیکن اس فوج پر چند جرنیلوں نے قبضہ کر لیا ہے ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کے لئے برّی فوج کو بدنام کیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ خود غرض جرنیلوں سے فوج کو بھی اور قوم کو بھی رہائی دلائی جائے۔ گذشتہ گیارہ سال میں اسلام کا مذاق اُڑایا گیا، آئین و قانون کی دھجیاں بکھیری گئیں اور آئین و قانون کی خلاف ورزی کا یہ بدترین دور ہے۔"

(ہفت روزہ ایشیا بابت ۳۱ جولائی ۱۹۸۸ء صـ۲۵)

خیال رہے کچھ عرصہ تک خود جماعتِ اسلامی بھی ان کے دورِ حکومت میں شریکِ اقتدار رہی ہے۔ بعد میں بھی اسے مارشل لاء کی بی ٹیم کا خطاب دیا گیا تھا۔ اب ووٹ حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے محسن پر طعن و تشنیع کے تیر چلانے شروع کر دیئے ہیں۔

۴۔ روس میں مذہبی آزادی

حال ہی میں روس میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو مکمل مذہبی آزادی دی گئی ہے۔ اس کے جو فوری نتائج سامنے آئے ہیں، ان پر تبصرہ کرتے ہوئے ہفت روزہ معاصر چٹان اپنی ۱۴ اگست ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔

"روس میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں کی بھی خاصی تعداد موجود ہے لیکن یہودیوں

کو بھی مذہبی آزادی نہ تھی۔ موجودہ گلاس نوسٹ، یا کھلی پالیسی، کے پیشِ نظر عیسائیوں اور یہودیوں کی مذہبی آزادی کے علاوہ ۶۰ ملین مسلمان بھی اپنی اسلامی اقدار کو فروغ دے سکیں گے اسی مذہبی آزادی کے پیشِ نظر روس کے مختلف علاقوں میں مذہبی نظریات کی بنا پر چپقلش شروع ہو چکی ہے جس کی ایک بڑی مثال آذربائی جان اور آرمینیا کی سوویت جمہوریتوں کے درمیان آذربائی جان کے ایک علاقے کے بارے میں جو تنازعہ فریقین کے سخت موقف کی وجہ سے سپریم سوویت میں پہنچ گیا ہے اور جو مظاہروں اور ہڑتالوں کی صورت میں اب بھی جاری ہے۔ یہی جھگڑا جس کی بنیاد مذہب پر ہے سوویت جمہوریہ جارجیا میں بھی پہنچ گیا ہے جہاں کے آذربائی جان باشندوں نے آرمنی باشندوں پر حملے کئے ہیں گویا اب مذہبی تحریکیں اور مذہبی رنگ روس میں جمتا جا رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اسلام جیسا آفاقی اور عالمگیر مذہب روس میں مقبولیت حاصل کر جائے۔

(ہفت روزہ چٹان بابت ۱۴ اگست ۱۹۸۸ء صفحہ ۴)

اسلام جیسے آفاقی دین کی جس طرح یورپ میں تبلیغ کی جا رہی ہے۔ اس کی جھلک حقائق وعبر کے شروع میں دکھائی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی کو اس بارے میں کوئی خوش فہمی ہو تو اس کا کیا علاج؟

۵- اولیائے کرام کی صحبت۔

اولیائے کرام کی صحبت کے بارے میں ایک عالم دین فرماتے ہیں۔

"میں نے اپنے والد ماجد قدس سرہٗ سے سُنا کہ وہ جو مشہور شعر ہے کہ

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یعنی اولیاء کرام میں سے کسی کی ایک لمحے کی صحبت کا میسّر آجانا سو سال کی بے ریا اطاعت سے بہتر ہے۔ والد صاحب قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے کہ بعض لوگ اس شعر کو مبالغہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس شعر میں شاعرانہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے کہ ایک لمحے کی صحبت سو سال کی بے ریا اطاعت سے بہتر ہے، لیکن فرمایا کہ اس شعر میں مبالغے کا تو کیا سوال پیدا ہوتا، اصل حقیقت کو محتاط انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت حکیم الامت مجدد ملت قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ اگر شاعر یوں بھی کہتا تو صحیح ہوتا کہ۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یعنی اولیائے کرام کی ایک لمحہ کی صحبت سو لاکھ سال کی بے ریا طاعت سے بھی بہتر ہے اللہ کے ولی کی ایک لمحے کی صحبت کا میسّر آجانا اتنی بڑی قسمت ہے تو حاضری کی سب سے بڑی کشش یہ تھی کہ الحمدللہ حضرت والا یہاں تشریف فرما ہیں۔

(ماہنامہ البلاغ کراچی بابت اگست ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۲)

قارئینِ طلوعِ اسلام شاید یہ سمجھیں کہ یہ کسی بریلوی مکتبِ فکر کے کسی عالمِ دین کی تحریر ہے۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ دیوبندی مکتبِ فکر کے ایک بہت بڑے مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے جناب محمد تقی عثمانی صاحب (جو غالباً شرعی عدالت کے جج بھی رہے ہیں) ہیں اس کی روایت اپنے والد صاحب سے کر رہے ہیں۔ حکیم الامت سے مراد، مولانا اشرف علی تھانوی صاحب ہیں۔ جب اولیائے کرام کی ایک لمحہ کی صحبت، سو لاکھ سال کی عبادت سے بہتر ہے تو پھر کسی کو ظاہری عبادات میں اپنی عمر صرف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

کراچی میں

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور

کی جملہ مطبوعات

علمی کتاب گھر، اردو بازار، کراچی فون ۲۱۸۷۱۳ اور ۲۱۶۹۴۲ سے بھی دستیاب ہیں۔